Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date
			21 c

غالبیات

چند

عنوانات

کالی داس گپتا رضا

:- ناشر :-

وِمل پبلیکیشنز

305, CHURCHGATE CHAMBERS,

5, NEW MARINE LINES,

BOMBAY-400020

سول ڈسٹری بیوٹرز

ساکار پبلیشرز پرائیویٹ لمیٹیڈ

107- JOLLY BHAVAN-1

10 NEW MARINE LINES,

BOMBAY- 400020

ناشر:- وِمل پبلی کیشنز۔ بمبئی ۴۰۰۰۲۰

تاریخ اشاعت:- ۲۶ جنوری ۱۹۸۲ء

قیمت:- پچاس (۵۰/=) روپے

پرنٹر:- دشرتھ جوشی نے وِمل پبلی کیشنز کے لئے مہاراشٹر پرنٹنگ اسکول پونا ۳۰ میں چھپواکر وِمل پبلیکیشنز بمبئی ۴۰۰۰۲۰ سے شائع کیا۔

فہرست

۱

غالب کا ملازمِ خاص ۔ کلّو داروغہ

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

(۱) غالب کی زندگی میں

غالب کے کم از کم ۱۹ خطوں میں کلّو کا ذکر آیا ہے۔ یہ سب غالب کے تلامذہ اور احباب کے نام ہیں۔ منشی نبی بخش حقیر (۳ خط) مجروح (۳ خط) حسین مرزا (۳ خط)، یوسف مرزا (۲ خط) شفق (۱ خط) بے خبر (۱ خط) سالک (۱ خط) حکیم غلام نجف خاں (۱ خط) علائی (۱ خط) ثاقب (۱ خط منظوم) میاں داد خاں سیاح (۱ خط)۔

پہلا خط جس میں کلّو کا ذکر آیا ہے، حقیر کے نام ہے اور ۲۱ مئی ۱۸۵۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ غالب کہتے ہیں۔

"کل رات کو پا کھل کا مربّہ مرتبان میں رکھ کر اور اس کو مومی جامہ سے بند کیا اور اس پر اپنی مُہر کر کر کلّو کے ہاتھ مرزا (حسن علی بیگ) کے پاس بھجوا دیا۔ کلّو ان کو مربّہ دے کر رات کو اپنے گھر رہا۔ اب صبح ہوئی اور کلّو آیا تو اس نے بیان کیا کہ مرزا حسن علی بیگ نے بندگی کہی ہے اور کہا ہے کہ میں کل نہ جاؤں گا، پرسوں جاؤں گا........"[۱]

اس خط سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ کلّو کوئی پانچ سات سالہ بچہ نہ تھا (اس وقت بوڑھا یا ادھیڑ عمر کا تو وہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، کیونکہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا اس نے بہت لمبی عمر پائی) جو ایسا ذمہ داری کا کام کر سکتا۔ میرے خیال میں کلّو اس وقت ۲۰ یا ۲۲ سال کا ضرور رہا ہوگا۔ اور اس طرح اس کا سالِ ولادت ۱۸۳۰ء کے قریب ہونا چاہئے۔ دوسری یہ کہ کلّو خاص دلّی کا رہنے والا تھا۔ اور رات کو غالب کے مکان پر نہیں رہتا تھا، بلکہ اپنے گھر سونے کے لئے چلا جاتا تھا۔ اس کی تصدیق[۲] ۱۶ دسمبر

---

[۱] نادراتِ غالب ص ۲۳ خط ۱۹

[۲] خطوطِ غالب از مہر ص ۳۹۳ خط ۵

۱۸۵۹ء کے ایک خط بنام حسین مرزا سے بھی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں۔

"پرسوں کلّو جوتا لے آیا، کل دونوں طرف سے کھلا ہوا (پارسل) لے کر گیا۔ ڈاک کے کارپردازوں نے الٹا پھیر دیا۔ اور کہا کہ پولندہ بنا لاؤ۔ پولندہ بنا کر لے گیا۔ کہا، بارہ پر دو بجے لے جائے گا۔ (کلّو وہاں) بیٹھا رہا۔ رات کے نو بجے (پارسل) اس (کلّو) کے سامنے روانہ ہوا۔ رسید لے کر اپنے گھر گیا۔۔۔۔۔"

یعنی وہ پارسل کی رسید لے کر غالب کے پاس نہیں آیا۔ بلکہ زیادہ رات ہو جانے کی وجہ سے اپنے گھر چلا گیا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ کلّو کا یہ دستور کم از کم ملازمت کے پہلے سات سال تک ضرور قائم رہا۔

کلّو کی عمر کے بارے میں بگا بیگم صاحبہ (باقر علی خاں کامل کی اہلیہ جنھوں نے غالب کی زندگی کا آخری دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا) کا قول ہے[1] "کہ کلّو چودہ برس کی عمر میں مرزا (غالب) صاحب کے پاس آکر رہے۔" چودہ برس کی عمر کے تعین میں حافظے کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کلّو ۱۸۵۲ء (خط بنام حقیر) سے کئی برس پہلے غالب کی ملازمت میں آیا ہو۔

کلّو جس کا اصل نام کالے خاں تھا، غالب کے خطوں میں پہلی بار ۱۵ ستمبر ۱۸۵۴ء کے خط میں داروغہ (یعنی غالب کے ملازمین کے عملے کا سربراہ) کہہ کر پکارا گیا۔ حقیر کو لکھتے ہیں

"صاحب ایک تپ پھیلی ہے کہ کوئی گھر نہ ہوگا جس کے آدھے آدمی تپ میں مبتلا نہ ہوں۔ باری کی تپ نوبتہ۔ کلّو داروغہ، اسکی ماں، مداری کی گھر والی، اس کے بچے، سب بیمار۔۔۔۔۔"

اگر میرا قیاس کردہ سالِ ولادت ۱۸۳۰ء صحیح ہے تو داروغگی کا خطاب پانے کے وقت کلّو ۲۴ سال کا قرار پاتا ہے۔ یوں بھی اس سے کم عمر کے ملازم کا داروغۂ دیوان خانہ مقرر ہونا تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] آئینۂ غالب ص ۹

معلوم ہوتا ہے کہ کلّو کم از کم شروع شروع میں اپنے دوسرے رُفقاءِ کار کی طرح صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا۔ ۴ جون ۱۸۵۴ء کے خط بنام حقیر میں غالب رقمطراز ہیں۔ "میرے چار خدمت گار ہیں۔ چاروں روزہ دار ہیں[1]۔" ظاہر ہے کہ ان چار خدمت گذاروں میں ایک کلّو ہے۔ یا پھر مئی ۱۸۶۱ء کا خط بنام مجروح۔۔ "کلّو، ایاز کے سر پر قرآن رکھو، کلیان کے ہاتھ میں گنگا جلی دو۔۔۔[2]" ایک منظوم خط ثاقب کے نام ملتا ہے۔ اس رباعی میں غالب نے کلّو کو حاجی لکھا ہے۔ کیا کلّو واقعی حج کر آیا تھا یا کلّو کے مذہب سے لگاؤ کو دیکھتے ہوئے غالب نے ایسا لکھ دیا ہے؟۔

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
ثاقب حرکت یہ کی ہے بے جا تم نے
حاجی کلّو کو دے کے بے وجہ جواب
غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے[3]

مگر کلّو کے اس مذہبی شغف کے متوازی چند چشم دید بیانات بھی ہیں اور وہ اس قابل ہیں کہ انھیں راوی ہی کی زبان میں بیان کیا جائے۔ عارف کے بھتیجے مرزا محمد حسن خاں عرف خضر مرزا کہتے ہیں[4]

"کلّو داروغہ گلاس دھو کر آدھ پاؤ شراب اس میں ڈال دیتا اور گلاس ڈھانک کر ان (غالب) کے پاس رکھ دیا کرتا تھا ۔۔۔۔۔ یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔۔۔۔"

حالی کہتے ہیں۔

"جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں، اس کی کنجی (کلّو) داروغہ کے پاس رہتی تھی ۔۔۔ داروغہ (کلّو) نہایت

۱؎ نادرات غالب ص ۶۳ خط ۴۶
۲؎ " " ص ۵۳ خط ۴۰
۳؎ خطوط غالب از مہر ص ۲۹۷ خط ۳۵
۴؎ ادبی دنیا سالنامہ ۱۹۴۰ء ص ۲۴۶

خیر خواہ، تھا (یعنی رات کو مانگنے پر بھی زیادہ شراب نہ

دیتا تھا ... ۱)

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے آخری ۱۸ سال میں کلّو ان کی زندگی کا جزو بن گیا تھا۔ گھر میں، سفر میں، آرام میں، سفر میں وہ ہر قدم پر غالب کا ہم قدم ہے۔ غالب بھی ہر طرح کلّو کا خیال رکھتے ہیں۔ بیماری میں اپنے بچوں کے ساتھ، اس کی صحت کے لئے بھی دعائیں مانگتے ہیں۔ خطوں میں سے ذیل کے اقتباسات اس کے شاہد ہیں۔

۱۵ر جولائی ۱۸۵۹ء
بنام یوسف مرزا

اس وقت کلّو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی امید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل ــــ

۳۱ر دسمبر ۱۸۵۹ء

بنام حسین مرزا

میر منشی سے ملا - ان کے خیمہ میں بیٹھکر صاحب سکرٹر بہادر کو اطلاع کروائی۔ چپراسی کے ساتھ کلّو بھی گیا جواب آیا کہ ہمارا سلام دو اور کہو کہ فرصت نہیں ہے۔

؟ ... ۱۸۶۰ء
بنام شفق

میرے گھر میں دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں ایک بڑا لڑکا (باقر علی خاں) اور ایک میرا داروغہ (کلّو) خدا ان دونوں کو صحت دے۔

۲۲ر ستمبر ۱۸۶۱ء

بنام مجروح

کلّو داروغہ بیمار ہو گیا تھا، آج اس نے غسلِ صحت کیا۔

۱۸۶۲ء
بنام بے خبر

اب دیوان خانہ میں ایک میں ہوں اور ایک داروغہ (کلّو اور ایک بیمار خدمت گار۔

---

۱ یادگارِ غالب (معیاری ادب) ص ۸۲

۱۱ر جولائی ۶۴ ۱۸ء — بنام سالک

کلّو داروغہ کورنش عرض کرتا ہے اوروں کو یہ پایہ حاصل نہیں کہ وہ کورنش بھی بجا لائیں۔

۲۱ر اکتوبر ۶۵ ۱۸ء — بنام حکیم غلام نجف خاں

(رام پور میں) میں خوش، لڑکے (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) بھی خوش۔ کلّو اچھا ہو گیا۔

۲۲ر دسمبر ۶۵ ۱۸ء — بنام علائی

کلّو اور لڑکا نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔

۱۷ر جون ۶۶ ۱۸ء — بنام سیّاح

لے لو! آج بریلی سے ایک بہنگی ایک دوست (عبدالجمیل جنوں) کی بھیجی ہوئی آئی، دو ٹوکرے، ہر ٹوکرے میں ستّو آم۔ کلّو داروغہ نے میرے سامنے وہ ٹوکرے کھولے۔ دو سو میں تراسی آم اچھے نکلے اور ایک سو سترہ آم بالکل سڑے ہوئے۔

اس طرح اور بھی خط ہیں، جن میں کلّو داروغہ اور اس کے ساتھی ملازموں کا نام اور کام موجود ہے ان میں سے ایک خط کا ذکر یہاں خاص طور پر کیا جاتا ہے۔ یعنی خط مورخہ ۲۸ر نومبر ۱۸۵۹ء بنام یوسف مرزا لکھتے ہیں۔

"اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلّو، کلیان، ایاز، یہ باہر، مداری کے جورو بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔"

اس سے پہلے ۱۵ر ستمبر ۱۸۵۴ء کے خط بنام حقیر میں تپ کا ذکر کرتے ہوئے غالب کہہ چکے ہیں کہ کلّو داروغہ، اسکی ماں، مداری کی گھر والی، اس کے بچے، سب بیمار "پڑے ہیں۔ ۲۶ر جولائی ۱۸۵۹ء کے خط بنام یوسف مرزا میں لکھا ہے کہ" باقر علی اور حسین علی، اپنی دادی کے ساتھ ہیں .... قطب صاحب گئے ہوئے ہیں، ایاز اور نیاز علی بھی ان کے ساتھ ہیں"۔ ۱۸ر اگست ۱۸۵۹ء کے خط بنام یوسف مرزا میں تحریر ہے "یا علی، یا علی، یا علی،

دس بار دل میں کہا ہوگا کہ مداری کا بیٹا دوڑا ہوا آیا اور تین خط لایا۔ یعنی وہ نیچے حویلی میں تھا، ڈاک کے ہرکارے نے خط لا کر دیے، نیاز علی اُوپر لے کر آیا" ۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ء کے خط بنام علائی میں ہے۔ "کلو اور لڑکا نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔"

مداری (پورا نام مداری خاں) غالب کا ایک قدیم نوکر تھا۔ اس کا ذکر بطور ایک فعّال نوکر کے پہلی بار پنج آہنگ (پہلا ایڈیشن مطبوعہ ۱۴ اگست ۱۸۴۹ء) کے ص ۲۰۹ پر آیا ہے۔ غالب دہلی سے مرزا علی بخش خاں کو لکھتے ہیں..... مداری خاں رقعہ رسد و نامہ را مے رساند (یعنی مداری خاں میرے رقعے کیساتھ آپکے پاس پہنچتا ہے)..... گویا مداری ۱۸۴۹ء سے پہلے غالب کا ملازم تھا، مگر مجھے اس کے بعد کسی جیتے جاگتے مداری کا نام نہیں ملا۔ ۱۸۵۴ء، ۱۸۵۹ء کے اوپر بیان کردہ خطوں میں مداری کی بیوی اور اس کے بچوں کا ذکر تو ملتا ہے مگر خود مداری کا نہیں۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۴ء کی درمیانی مدت میں مداری کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ لڑکا نیاز علی جس کا ذکر اوپر کئی خطوں میں آیا ہے۔ مداری ہی کا بیٹا تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۵ء سے پہلے مداری کی اہلیہ یعنی نیاز علی کی والدہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ بقول بگا بیگم صاحبہ (آئینہ غالب ص ۹) (مداری جسے وہ مداری خاں کہتی ہیں اور جسے انھوں نے نہیں دیکھا تھا) کے لڑکے نیاز علی کو "مرزا صاحب نے لے لیا تھا"[۱] اور "مدار خاں کی بیٹی آبادی کو کلو نے اپنی بیٹی بنا لیا تھا" مداری کے غالباً یہی دو بچے تھے۔

اب مندرجہ بالا سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غالب کے یہاں ملازمت کے زمانے میں کلو کی ماں زندہ تھی اور باپ شاید زندہ نہ تھا۔ کلو کی یا تو شادی ہی نہیں ہوئی تھی یا اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ جبھی اس نے مداری کی بیٹی آبادی کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔

---

[۱] یعنی اپنے یہاں بطور ملازم رکھ لیا تھا۔

ایک جگہ عارف کے بیٹے حسین علی خاں کا غالب سے شوخیاں کرنے کا حال بیان کیا کرتے ہوئے خضر مرزا فرماتے ہیں۔ (آئینۂ غالب ص ۷) "کھیل تماشے کا تو انھیں (حسین علی خاں کو) لپکا تھا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے پر ایک دفعہ بیس روپے خرچ کر دئیے اور پھر مرزا صاحب کے پاس منہ بسورتے ہوئے آئے کہ دادا جان بیس روپے دلوائیے۔ مرزا صاحب نے کلو کو بلا کر کہا۔ "بھئی انھوں نے ایک پتھر اور مارا ہے دے دے بیس روپے"۔

غالب کی زندگی میں کلو کا ذکر آخری بار غالب کے انتقال کی گھڑیوں میں میں آتا ہے۔ مالک رام رقمطراز ہیں (ذکرِ غالب بار پنجم ص ۱۳۳):

> بگا بیگم فرماتی تھیں کہ موت سے ایک دن پہلے (مرزا صاحب کو) کچھ افاقہ ہوا: تو کھانے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ پھر ملازم سے کہا کہ مرزا جیون بیگ (یعنی مرزا باقر علی خاں اور بگا بیگم کی سب سے بڑی صاحبزادی) کو بلالاؤ ۔ یہ عموماً انھیں کے پاس کھیلتی رہتی تھیں۔ کلو[1] ملازم انھیں بلانے کے لئے محل سرائے میں آیا تو وہ آرام کر رہی تھیں بگا بیگم نے کہا کہ سو رہی ہے۔ جونہی جاگتی ہے، بھیجتی ہوں۔ ملازم (کلو) نے واپس آکر یہی کہہ دیا۔ اس پر فرمایا کہ بہت اچھا، جب وہ آئے گی ہم کھانا کھائیں گے۔ اس کے بعد جونہی گاؤ تکیے پر سر رکھا، بے ہوش ہو گئے ...... اسی حالت میں اگلے دن ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دوپہر ڈھلے اس باکمال کا انتقال ہو گیا ....

---

[1] آئینۂ غالب ص ۱۱ پر یہی روایت درج ہے مگر وہاں ملازم کا نام کلو کی بجائے احمد بیگ ہے۔ لیکن مالک رام صاحب کی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ حمید احمد خاں صاحب ایک ہی بار بگا بیگم صاحبہ کی ملاقات کو گئے جبکہ مالک رام صاحب اکثر ان سے ملاقات کیا کرتے تھے بلکہ بعد میں اس بزرگ بیگم نے ان سے پردہ کرنا بھی ترک کر دیا تھا۔

(۲) غالب کے انتقال کے بعد

ذکر غالب[1] میں لکھا ہے کہ "مداری، کلو داروغہ اور کلیان تینوں بہت لمبے عرصہ تک ان (غالب) کے پاس (ملازم) رہے۔ بلکہ کلو کا انتقال بھی مرزا کے بعد اسی گھر میں ہوا" (جس میں مرزا غالب کا انتقال ہوا تھا)۔

چونکہ کتاب میں اس بیان کے ماخذ کی نشاندہی نہیں کی گئی تھی۔ اس لئے میں نے جناب مالک رام سے ماخذ کے بارے میں اور کلو کی تاریخ وفات کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا[2]۔

"کلو کے بارے میں اطلاع بگا بیگم سے ملی تھی۔ افسوس کہ اس وقت میں نے زیادہ پوچھ گچھ نہ کی ورنہ ممکن ہے کہ اسکا سال وفات بھی معلوم ہو جاتا۔ وہ ٹھیک سال تو شاید نہ بتا سکتیں لیکن کچھ اتا پتا ضرور مل سکتا تھا ......"

پھر بھی رہ رہ کر ذہن میں یہی خیال آتا تھا کہ کلو امراؤ بیگم (اہلیہ غالب) ہی کی زندگی تک اس مکان میں رہ پایا ہوگا؟ کیا بیگم کے انتقال کے بعد بھی وہاں کلو کی سکونت کا امکان ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا امکان نہیں تو کلو زیادہ سے زیادہ ۱۸۷۰ء تک انتقال کر چکا ہوگا؟ مگر ہمارے پاس شہادتیں موجود ہیں کہ کلو ۱۸۷۰ء کے کافی عرصہ بعد تک زندہ رہا۔ چنانچہ ان وسوسوں کو ذہن میں رکھ کر میں نے پھر استفسار کیا۔ جناب مالک رام نے دیانت داری سے اس بات پر روشنی ڈالی[3]۔

"... آپکے سوال کا جواب آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ جب اس سلسلے میں میری گفتگو مرحومہ بگا بیگم سے ہوئی ہے تو ان کے الفاظ تھے "کلو کی وفات اسی مکان میں ہوئی، ہم اس وقت نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں مرحوم کے مکان میں بیٹھے تھے۔ جہاں بگا بیگم اپنی بیوگی کے بعد

---

[1] پانچواں ایڈیشن مطبوعہ فروری ۱۹۷۶ء ص ۲۰۵

[2] خط بنام راقم مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۸۰ء

[3] خط بنام راقم ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۰ء

سکونت پذیر ہوگئی تھیں اور وہیں انکا انتقال بھی ہوا میں نے
تفصیل دریافت نہیں کی کہ اسی مکان سے ان کی کیا مراد ہے۔ اس
سے ظاہراً یہی معلوم ہوتا ہے کہ کلو امراؤ بیگم کی وفات کے بعد نیر
رخشاں کی ملازمت میں آگیا تھا اور انھیں کے وہاں اسکی وفات ہوئی
رہا یہ کہ تقریباً کون سے سال اس کا انتقال ہوا ہوگا اس کے بارے
میں قیاس ناممکن ہے۔ یہ تک تو معلوم نہیں کہ غالب کی وفات کے
وقت اس کی عمر کیا تھی۔ اگر اس کا کچھ اندازہ ہوتا تو ممکن تھا کہ کچھ
قیاس آرائی کی جاسکتی"۔

محقق کا یہ فرض ہے کہ امر زیر تحقیق کے بارے میں جو کچھ بھی وہ جانتا ہو دیانتداری سے ظاہر کر دے، اپنی طرف سے کوئی قیاسی اضافہ نہ کرے۔ یہی جناب مالک رام نے کیا۔ البتہ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مزید تحقیق سے کلو کے سالِ ولادت کی طرح اس کے سالِ وفات کا بھی کچھ سراغ مل گیا۔ مرحومہ بگا بیگم نے ملاقات کے دوران جو حمید احمد خاں نے ان سے جولائی ۱۹۳۸ء میں کی تھی، فرمایا تھا [1]

"کلو داروغہ کو مرے ہوئے پندرہ برس ہوگئے"۔ ....

گویا کلو کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہوا۔ اگر پندرہ سال کے بیان کو ایک ضعیف خاتون کا قیاسی بیان بھی مان لیا جائے تو بھی ۱۹۲۰ء کو سالِ وفات تسلیم کر لینا کچھ زیادہ بے جا نہ ہوگا۔ اس طرح ۱۸۳۰ء کو سالِ ولادت مان کر یہ کہنا پڑیگا کہ کلو داروغہ نے سال دو سال اِدھر اُدھر ۹۰ برس کی لمبی عمر پائی، وہ ۲۰ سال سے بھی کم عمر میں مرزا غالب کی ملازمت میں آیا، تقریباً ۲۰ سال ان کی ملازمت میں رہا اور ان کے انتقال کے بعد تقریباً ۵۰ سال زندہ رہا۔ بگا بیگم فرماتی ہیں [2]

"لوگ ان (کلو) کی زیارت کو بہت آتے تھے .... (وہ) پاؤں کی آہٹ
سے پہچان لیتے تھے کہ لڑکیاں ہیں بہوئیں ہیں یا بوڑھیاں ..."

---

[1] آئینۂ غالب ص۹   [2] آئینۂ غالب ص۹

خسرو مرزا لکھتے ہیں[1]

"(۱۸۹۵ء) کے بعد میں اپنے علی گڈھ کے دو استادوں کو
ان کی خواہش کے مطابق دہلی لایا اور دادا غالب مرحوم کے ملازم
داروغہ کلو سے جو ہماری محل سرا کے ڈیوڑھی بانوں میں شمار ہوتے
'ملاقات کرادی اور داروغہ کلو سے ان کی گفتگو ہوئی .....
داروغہ کلو نے یہ بھی بتایا کہ مرزا غالب دربارِ قیصری کے رکن بن گئے تھے
اوران کو ہفت پارچات کا خلعت معہ مالائے مروارید اور جیغہ مرصّع
عطا ہوا تھا۔ یہ گفتگو سن کر وہ ان کی ناخواندگی کی وجہ سے متحیّر ہوکر
عش عش کرنے لگے۔ یہ داروغہ وہ تھے جن کو بعد وفاتِ دادا
غالب ہماری محل سرا کی ڈیوڑھی پر ملازم رکھ لیا گیا تھا اور یہ ہمارے
تمام ملازمین میں اس زمانہ کی تہذیب کے مطابق داداکلو کے
نام سے خطاب کئے جاتے تھے۔"

حمیدہ سلطان صاحبہ[2] جن سے میں نے ۱۳ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کو علی منزل دہلی میں ملاقات کی
تھی، فرماتی ہیں۔

"کلو کا انتقال نانی اماں بگاّ بیگم صاحبہ کے قول کے مطابق محل سرا کی
ڈیوڑھی میں ہوا۔ یہ محل سرا کا مکان نواب ضیاءالدین احمد خاں نے اپنی
بیٹی بگا بیگم (نانی اماں) کے جہیز میں دیا تھا۔ نانی اماں فرماتی تھیں
کہ کلو خاصی عمر کے آدمی تھے بشاید ۸۰، ۹۰ سال کی عمر کے۔ داروغہ جو
تھے ڈیوڑھی میں پڑے رہتے تھے۔"

اب سید حالب دہلوی نے جو کچھ کلو سے سنا اور معتبر سمجھ کر درج کر دیا وہ بھی پڑھ لیجئے گا[3]
"کلو نے ان (غالب) کی وفات کے بعد پھر کسی کی نوکری ہی نہیں کی،

---

[1] اصھارِ غالب

[2] بگا بیگم صاحبہ رشتے سے حمیدہ سلطان صاحبہ کی سگی نانی تھیں۔ بگا بیگم صاحبہ کے انتقال (۱۹۴۵ء)
کے وقت حمیدہ سلطان صاحبہ کی عمر ۳۰ سال سے اوپر تھی۔ اسلئے میں نے بطورِ خاص ان سے چند سوالات کئے تھے۔

[3] مکتوبات آزاد بار دوم - دیباچہ (۱۹۰۷ء) ص ۱

اور ساری عمر ان کی یاد اور فاتحہ خوانی میں گذار دی۔[1] راقم الحروف نے کلو سے بارہا مرزا صاحب مرحوم کے حالات سنے ہیں مگر کبھی اس نے ٹھنڈا سانس لیے اور سخت حسرت ظاہر کیے بغیر ان کا ذکر شروع نہیں کیا۔ دیوان خانہ میں بیٹھنے والوں کی نسبت وہ کہا کرتا تھا کہ جناب مرزا صاحب بعض اوقات دنوں نیچے نہ اترتے تھے اور ان کی صورت نہ دیکھتے تھے۔ مگر وہ غل غپاڑہ گویا ان کی غذائے روح تھا، جس کے بغیر انھیں کل نہ پڑتی تھی۔ ان لوگوں سے اگر وہ کبھی کام لیتے تھے تو یہ لیتے تھے کہ جب کوئی نیا مضمون باندھتے تھے اور اسکی مسرت کے کیف میں بیخود ہو جاتے تھے تو نیچے تشریف لے آتے تھے اور وہ شعر لوگوں کو سناتے تھے۔ اور داد لے کر پھر الٹے پاؤں واپس چلے جاتے تھے۔ کبھی ایسا موقع ہوتا تھا کہ دیوان خانہ میں چند ناخواندہ شخص جمع ہیں جو شعر کا مطلب تو درکنار اس کی ترکیب لفظی کو بھی نہیں سمجھ سکتے تھے مگر مرزا صاحب موصوف پر شوق کا وہ غلبہ ہوتا تھا کہ انھیں کو سناتے تھے۔ ایک ایک لفظ کی تشریح کر کے بتلاتے تھے اور داد لیتے تھے۔ کلو کا بیان ہے کہ کئی مرتبہ ایسا بھی دیکھا کہ دیوان خانے میں چڑیا بھی نہیں، لیکن مرزا صاحب آئے اور دروازے میں کھڑے ہو کر آپ نے فرمایا "لو بھئی! سنو! کیا مضمون ہاتھ آیا ہے۔" اور پھر آپ نے شعر پڑھا اور ضروری تشریح کی اور مطمئن ہو کر پھر کوٹھے پر چلے گئے۔ ملازم چونکہ ان حالتوں سے واقف تھے اس لئے خاموش رہتے تھے اور بعض اوقات کسی معمولی آدمی کو چپکے سے دیوانخانہ میں بھیج دیتے تھے کہ مرزا صاحب کی تکلیف رائیگاں نہ جائے اور وہ آزردہ نہ ہوں، حالانکہ انہی مرزا نوشہ کی نازک دماغی کا یہ حال تھا کہ بعض

---

[1] یہ قطعاً غلط ہے کلو کو نواب ضیاءالدین احمد خاں کے یہاں باقاعدہ ملازم رکھ لیا گیا تھا۔

موقعوں پر جناب نواب ضیاء الدین خاں مرحوم نیر و رخشاں اور
نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مبرور اور نواب علاء الدین خاں
علائی مغفور جیسے رؤسائے بلند پایہ منتیں کرتے کرتے تھک
جاتے تھے اور وہ ایک مصرع تک زبان پر نہ لاتے تھے۔ اللہ اللہ
سچ کہا ہے کہ شاعر اپنے رنگ میں بادشاہ سے بڑھ کر ہوتا ہے"
اب اس بیان سے زیادہ سے زیادہ یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عمر کے ساتھ
ساتھ ان پڑھ اور وفادار نوکروں میں مبالغہ آرائی کی عادت میں بھی اضافہ
ہوتا رہتا ہے۔

غوث علی شاہ قلندر پانی پتی اور مرزا غالب

(مع ضمیمہ)

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

حضرت غوث علی شاہ قلندر (ولادت ۷ ستمبر ۱۸۰۴ء) نے ۶ مارچ ۱۸۸۰ء کو پانی پت میں انتقال کیا۔ شاہ صاحب نے ۲۰ فروری ۱۸۶۲ء کو پانی پت میں ورود کیا۔ اور پھر اپنی ۷۶ سالہ زندگی کے آخری ۱۸ سال ۱۶ دن اس شہر میں گذارے۔ اس لئے پانی پتی مشہور ہوئے۔

صوفی عالی مقام ہونے کے علاوہ شاہ صاحب کو شعر و سخن سے بھی بے حد رغبت تھی۔ بچپن میں انھوں نے ایک براہمن کے گھرانے میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے انھیں سینکڑوں اشلوک اور دوہے ازبر تھے۔ جنھیں وہ عربی، فارسی اور اردو اشعار کے دوش بدوش عام گفتگو میں استعمال کرتے رہتے تھے۔ غالباً شعر و سخن سے ہی دلچسپی انھیں مرزا غالب کے مکان پر لے گئی ہوگی۔

شاہ صاحب عمر میں غالب سے سات برس چھوٹے تھے اور سیر و سیاحت کے بے حد مشتاق تھے۔ اصل مسلک توحید تھا، اور رسوم و ظواہر کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی۔ اگرچہ انھوں نے ایک سے زیادہ بار حج کیا تھا مگر وہ ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ "ہمارے حج بھی ایسے تھے جیسے بچوں کی نماز یعنی نہ ان پر نماز فرض نہ ہم پر حج فرض۔"

ایک دفعہ ایک لمبی سیاحت کے بعد شاہ صاحب منزل بمنزل دہلی پہنچے اور چھ مہینے تک زینت المساجد میں مقیم رہے۔ انھیں ایام میں شاید وہ پہلی بار غالب سے ملے۔ تذکرہ غوثیہ میں شاہ صاحب کی زبانی لکھا ہے۔

"ایک[1] روز (ہم) مرزا نوشہ (غالب) کے مکان پر گئے۔ نہایت حسنِ اخلاق سے ملے۔ لبِ فرش تک آن کرلے گئے۔ تمام حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کا ایک غزل بہت ہی پسند ہے۔ علی الخصوص یہ شعر ؂

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو
تیرے کوچہ کی شہادت ہی سہی

کہا، صاحب یہ شعر تو میرا نہیں، کسی استاد کا ہے۔ فی الحقیقت نہایت اچھا ہے[2].... اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ تکلیف نہ کیجیے۔ مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کیلئے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ بے خوار، روسیاہ، گنہ گار، مجھکو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ البتہ اولش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔ ان کے مزاج میں کمال کسر نفسی اور فروتنی تھی۔
ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی سرور مصنف فسانہ عجائب لکھنؤ سے آئے، مرزا نوشہ سے ملے[3]۔ اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان میں کس کتاب کی عمدہ ہے۔ کہا

---

[1] تذکرہ غوثیہ، مطبوعہ ۱۸۸۱ء، ص ۹۸، مؤلفہ شاہ گل حسن قادری۔ اب، غلط یا صحیح، تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ یہ کتاب دراصل محمد اسمٰعیل میرٹھی کی تالیف ہے۔ (دیکھو ضمیمہ)

[2] اس کے بعد غالب کی وہ غزل درج ہے جس کا مطلع ہے۔

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

[3] تفصیل کے لئے دیکھو ضمیمہ۔

چار درویش کی ۔ میاں رجب علی بولے اور فسانۂ عجائب کیسی ہے؟
مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے اجی لاحول ولاقوۃ ۔ اس میں لطف زباں
کہاں ۔ ایک تُک بندی اور بھٹیارخانہ جمع ہے ۔ اس وقت تک
مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں ۔ جب چلے گئے تو
حال معلوم ہوا ۔ بہت افسوس کیا اور کہا ظالمو! پہلے سے کیوں نہ
کہا ۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے ۔ یہ قصہ سنایا
اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا ۔
آیئے آج ان کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں ۔ ہم
ان کے ہمراہ ہو لئے اور میاں سرور کی فرودگاہ پہ پہنچے ۔ مزاج
پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور
ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات
میں نے فسانۂ عجائب کو جو بغور دیکھا تو اسکی خوبیٔ عبارت
اور رنگینی کا کیا بیان کروں ، نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے ،
میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہو گی اور کیونکر
ہو اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا ۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں
بنائیں ، اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت
مسرور کیا ۔ دوسرے دن ان کی دعوت بھی کی اور ہم کو بھی بلایا ۔
اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی ۔ مرزا صاحب کا
مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے ۔ اور دراصل یہ
خیال بہت درست تھا . . . .

. . . . . . ۔ ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ تم کو کسی
سے محبت بھی ہے کہا کہ ہاں حضرت علی مرتضٰی سے ۔ پھر ہم سے
پوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا کہ واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر
بھی علی مرتضٰی کی محبت کا دم بھریں ، ہم ان کی اولاد کہلائیں
اور محبت نہ رکھیں؟ کیا یہ بات آپکے قیاس میں آسکتی ہے؟"

تذکرۂ غوثیہ کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا پڑے گا کہ اس تذکرے کی سندی حیثیت شک وشبہ سے بالا نہیں لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ یہ واقعہ صحیح ہوسکتا ہے۔ بلکہ ایک حد تک سالِ وقوع بھی متعین کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً

۱۔ مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ واقعہ شاہ صاحب کے پانی پت کے مستقل قیام سے پہلے کا ہے۔ چونکہ شاہ صاحب سنہ ۱۸۶۲ء میں پانی پت میں مقیم ہوئے تھے اس لئے یقینی طور پر یہ واقعہ سنہ ۱۸۶۲ء سے پہلے ظہور پذیر ہوا۔

۲۔ سرور ۱۸۵۹ء میں بنارس آکر راجہ بنارس کے ملازم ہوئے۔ اور پھر آخر عمر (سنہ ۱۸۶۹ء) تک یہیں رہے۔ مگر شاہ صاحب کہتے ہیں کہ وہ (سرور) لکھنؤ سے آئے۔ اگر یہ واقعہ سنہ ۱۸۵۹ء کے بعد کا ہوتا تو وہ لکھنؤ کی جگہ بنارس سے دلی آنے کا ذکر کرتے۔ گویا یہ واقعہ سنہ ۱۸۵۹ء سے پہلے کا ہے۔

۳۔ سرور کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انتزاعِ سلطنتِ اودھ سے قبل وہ دہلی گئے تھے۔ گویا یہ واقعہ سنہ ۱۸۵۶ء سے پہلے کا ہونا چاہئے۔

۴۔ سرور نے دہلی اور میرٹھ کا ایک سفر (غالباً پہلا سفر) سنہ ۱۸۵۴ء میں کیا۔ وہ لکھنؤ سے دہلی گئے تھے اور لکھنؤ ہی کو واپس آئے۔ غالباً اسی سفر میں وہ پہلی بار مرزا غالب سے ملے۔[1]

چنانچہ شاہ صاحب نے جس واقعہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے قوی قیاس ہے کہ وہ سنہ ۱۸۵۴ء ہی میں پیش آیا ہوگا۔ بعد ازاں (۱۸۵۹ء کے بعد) غالب نے جب سرور کی فرمائش پر "گلزارِ سرور" کی تقریظ لکھی تو اس میں یہ معنی خیز جملہ بھی لکھا کہ "مجھکو دعوے تھا کہ اندازِ بیان اور شوخیِ تقریر میں فسانۂ عجائب بے نظیر ہے۔ جس نے میرے دعوے کو اور فسانہ عجائب کی یکتائی کو مٹایا ہے وہ یہ تحریر (یعنی گلزارِ سرور) ہے۔" گویا غالب نے سرور کے خوش کرنے کو شاہ صاحب کی حاضری میں فسانۂ عجائب کی جو تعریف کی تھی اسے بھی برقرار

---

[1] رجب علی بیگ سرور۔ نیر مسعود۔ ص ۱۰۱۔

رکھا اور نئی کتاب کی تعریف بھی کر دی۔

۵۔ شاہ صاحب نے غالب سے دریافت کیا کہ کیا اُسے (غالب کو) کسی سے محبت ہے۔ غالب نے جواب دیا "ہاں" "حضرت علی مرتضیٰ سے"
یہ جواب غالب کے مسلک کے عین مطابق ہے۔ حضرت علیؓ سے غالب کی محبت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مثنوی ابرِ گوہر بار کے یہ دو ہی شعر ثبوت کے لئے کافی ہیں ؎

نبی را پذیرم بہ پیمان او
خدارا پرستم بہ ایمان او
خدائیش روا نیست ہر چند گفت
علی را توانم خداوند گفت

[میں نبیؐ کی پذیرائی اس لئے کرتا ہوں کہ علیؓ نے اس سے پیمان باندھا ہے۔ اور خدا کی پرستش اس لئے کہ علیؓ کا ایمان یہی ہے۔ چونکہ علیؓ کو خدا نہیں کہا جا سکتا اسلئے میں اسے خداوند یعنی آقا کہتا ہوں۔ (اگر روا ہوتا تو اسے خدا مانتا)۔]

۱۸۵۴ء میں یعنی غالب اور شاہ صاحب کی پہلی ملاقات سے ۱۸۶۹ء کے آغاز یعنی غالب کی وفات تک ۱۴ سال کا لمبا وقفہ ہے۔ اِس وقفے کے پہلے ۲ سال مزید سیر و سیاحت میں گذارنے کے بعد جس میں شاہ صاحب کی اور غالب کی ملاقات کا زیادہ امکان نہیں، شاہ صاحب ۱۸۶۲ء میں دہلی کے نزدیک پانی پت میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے۔ اس لئے یہ قرین قیاس ہے کہ اس وقفے کے بقیہ ۷ سالوں میں جبکہ شاہ صاحب کا گاہے بگاہے دہلی آتے جاتے رہنا معلوم ہے ملاقات ہوتی رہتی ہوگی۔ جبھی تو انہوں نے غالب کے انتقال کی خبر سن کر دلی رنج و غم کا اظہار کیا اور کہا "افسوس یہ ہمارے محب بھی چل دیئے"۔ شاہ گل حسن قادری[۱]

[۱] یا مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی؟

جو اس وقت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھے لکھتے ہیں[1]:

"ایک روز راقم (اگل حسن قادری) خدمت میں حاضر تھا کہ، کسی شخص نے مرزا نوشہ (غالبؔ) صاحب کے انتقال کی خبر سنائی آپ نے فرمایا — اِنّاللّٰہ واِنّا اِلیہ راجعون ؎

کھال دھونتی رہ گییو، نو بجہ بجھئے انگار
اہرن کو ٹھکو مٹو، اٹھ گئے میت لوہار

سدا نہ پھولے توریاں، سدا نہ ساون ہوئے
سدا نہ جوبن تھر رہے، سدا نہ جیوے کوئے

شنیدم کہ در روزگارِ کہن
شدہ عنصریؔ شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی
بفردوسی آمد کلاہِ مہی —
چو فردوسیؔ از دورِ فانی گذشت
نظامیؔ بملک سخن شاہ گشت
نظامیؔ چو جام اجل درکشید
بسر چتر اشعار سعدیؔ رسید
چو اورنگِ سعدیؔ فرو شد ز کار
سخن گشت بر فرقِ خسروؔ نثار
وزاں پس چو نوبت بجامی رسید
جہانِ سخن را تمامی رسید

---

[1] تذکرہ غوثیہ۔ مطبع فاروقی دہلی ۱۸۸۴ء ص ۳۵۵

عدم ہے یا کوئی کوئے صنم ہے
چلی جاتی ہے واں خلقت خدا کی

نہایت خوب آدمی تھے۔ عجز و انکسار بہت تھا۔ فقیر دوست بدرجہ غایت اور خلیق از حد۔ ایک روز جو ہم ان کے پاس گئے تو انہوں نے اپنے یہ دو قطعے[1] پڑھے تھے۔

فرصت اگرت دست دہد مختنم انکار
ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بدرودے

بروز حشر الٰہی چو نامۂ عملم
کنند باز کہ آں روز باز خواہِ من است
بکن مقابلہ آں داز سر نوشتِ ازل
اگر زیادہ و کم باشد آں گناہِ من لست

رند مشرب، بے شر، رحم دل تھے اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے لیکن افسوس یہ ہمارے محب بھی چل دیئے

ندی ناؤ کا بیٹھنا پلک ایک کی پریت
پل میں بچھڑے جات ہیں یہی جگت کی ریت

ہم دیکھیں جگ جات ہے جگ دیکھے ہم جائیں
ہم تو بیٹھے راہ پر کس کس کو پچتائیں ...''

---

[1] یہ دونوں قطعے شاہ صاحب ہی کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ورنہ غالب کے متداول کلام میں شامل نہیں۔

آج جہاں پانی پت میں شاہ غوث علی شاہ قلندرؒ ایسی جامع صفات و کمالات ہستی کی درگاہ مرجعِ خلائق ہے وہاں دہلی کے باہر سلطان جی میں، چونسٹھ کھمبا کے متصل غالب ایسا نادر الوجود محوِ خواب ہے ؎
"ہاتف نے کہا۔ گنجِ معانی ہے تہِ خاک"۔

(ضمیمہ)

(ا) بعض کا خیال ہے کہ (ا) غالب کے ساتھ سرور کی ملاقات کی بات صحیح نہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ سرور غالب سے مل کر تنقیدی گفتگو کرتے اور غالب ان سے یہ نہ پوچھتے کہ 'تم کون ہو'؟
(ب) پھر غالب کو فسانۂ عجائب کا اسلوب اتنا ناپسندیدہ نہ ہوگا کیونکہ گلزارِ سرور کی غالب نے تعریف کی ہے اور اس کی تقریظ فسانۂ عجائب ہی کے انداز میں لکھی ہے۔ سرور غالب سے ملے ضرور ہوں گے لیکن (ج) تذکرۂ غوثیہ میں غوث علی شاہ کے حوالے سے جو مکالمہ لکھا ہے وہ صحیح نہیں معلوم ہوتا"۔

مندرجہ بالا میں کوئی دلیل ضمنی نہیں۔ محض اپنے موقف کی وکالت ہے۔ (ا) اگر بہت سے لوگ غالب کے یہاں جمع ہوں اور ان میں کوئی صاحب خانہ سے سوال کر بیٹھے جو تنقیدی پہلو لئے ہو تو یہ ضروری نہیں کہ غالب سوال کرنے والے سے پہلے اس کا حسب نسب دریافت کریں اور پھر جواب دیں۔
(ب) غالب نے اگر گلزارِ سرور کی تقریظ میں فسانۂ عجائب کا اسلوب اپنایا ہے تو یہ غالب کے اس اسلوب کی پسندیدگی کا ثبوت نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ پیرایہ غالب نے سرور کو خوش کرنے کے لئے اپنایا تھا۔ (ج) ممکن ہے غوث علی شاہ کے حوالے

سے لکھا ہوا غالب اور سرور کا مکالمہ حرف بحرف درست نہ
ہو اور مولف نے اپنے بیان میں کچھ گھٹا بڑھا دیا ہو۔ تاہم کچھ
اس قسم کی گفتگو دونوں میں ضرور ہوئی ہوگی ورنہ غوث علی شاہ
ایسے بیان ہی کیوں کرتے؟

(۲) اب یہ عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ تذکرۂ غوثیہ گل حسن
شاہ قادری کی تصنیف نہیں بلکہ محمد اسماعیل میرٹھی کی تصنیف
ہے۔ مالک رام (تلامذۂ غالب ص ۳۷۔ ۱۹۵۷ء حاشیہ)
لکھتے ہیں۔

"عام لوگ اس کتاب کو (تذکرۂ غوثیہ) سید گل حسن شاہ صاحب کی
تصنیف خیال کرتے ہیں کیونکہ ان ہی کا نام اس کے مصنف کی حیثیت
سے سرورق پر لکھا ملتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ سید گل حسن شاہ جس
خطہ ملک کے رہنے والے تھے وہاں کی زبان کا اس سے کیا تعلق جو
اس کتاب میں استعمال ہوئی ہے۔ میں نے کتاب کا اصلی مسودہ خود
مولانا اسمٰعیل مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا، ان کے صاحبزادے جناب
سیفی صاحب کے پاس دیکھا ہے جس کے بعد کوئی شبہ ہی نہیں
رہ سکتا کہ کتاب مولانا اسمٰعیل کی لکھی ہوئی ہے۔"

اس سے پہلے متن میں (تلامذۂ غالب ص ۳۶) لکھا ہے۔

"ایک تو (اسمٰعیل میرٹھی کی) طبیعت فطری طور پر نیک تھی اس پر
دورِ آخر کے مشہور ولی اللہ حضرت سید غوث علی شاہ پانی پتی کی
بیعت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ انہوں نے اپنے مرشد کے
حالات نثر میں تذکرہ غوثیہ کے عنوان سے لکھے ہیں۔"

نیر مسعود نے اپنی کتاب رجب علی بیگ سرور (ص ۱۴۱ حاشیہ) میں لکھا ہے
"جدید تحقیقات کے مطابق تذکرہ غوثیہ دراصل مولوی اسمٰعیل
میرٹھی کی تالیف ہے۔"

حیاتِ اسماعیل (۱۹۷۶ء) میں ڈاکٹر سیفی پریمی نے اس بات پر زیادہ تفصیل

سے روشنی ڈالی ہے۔

"حیات وکلیات اسماعیل مطبوعہ ۱۹۳۹ء میں تذکرۂ غوثیہ کو مولانا اسمٰعیل میرٹھی سے منسوب کیا گیا ہے (اس کے مؤلف خان بہادر محمد اسلم سیفی، اسمٰعیل میرٹھی کے چھوٹے بیٹے ہیں۔ تاریخ ولادت ۷ راگست ۱۸۸۰ء بمقام میرٹھ)

مگر اس کے پہلے ایڈیشن (۱۹۱۱ء) میں جو مولانا کی زندگی میں طبع ہوا اور جس کے مؤلف خان بہادر محمد اسلم سیفی ہی تھے۔ تذکرۂ غوثیہ کا ذکر شامل نہیں ہے۔ بلکہ مولانا اسماعیل میرٹھی نے دیباچہ بھی نہیں لکھا۔ صرف کلام یکجا کر دیا ہے۔ نثر کی ایک سطر بھی درج نہیں ہے۔ غالباً مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے اپنے پیر بھائی (شاہ گل حسن قادری) کی پردہ داری کی اور اپنی زندگی میں اخلاقاً حقیقت کو بے نقاب کرنے سے گریز کیا (ص ۲۵۷)

...... مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کے کتب خانہ میں اس کتاب کا قلمی نسخہ مولانا اسماعیل کے قلم کا لکھا ہوا محفوظ ہے۔ راقم (اسیفی پریمی) نے بچشم خود دیکھا ہے۔ (ص ۲۵۸)

اس مسودے میں بعض صفحات پر سید گل حسن شاہ کی تحریر بھی ہے۔ مثلاً "کیاہی" کی تشریح سید گل حسن شاہ کی تحریر میں ہے۔ اور درج ذیل شعر سید گل حسن شاہ کے قلم سے لکھا ملتا ہے۔

بھلا میں دیکھا ستم گرسنتہ سیاہی
رام نام کی پٹا لکھا لی، ابھی جاگیر پائی[1]

---

[1] یہ شعر تذکرۂ غوثیہ (مطبع فاروقی دہلی۔ ۱۸۸۴ء) کے صفحہ ۱۸۰ پر چھپا ہے اور یوں ہے ؎

بھلا میں دیکھا ست گرسنتہ سیاہی —— رام نام کی پٹا لکھائی آ ابھی جاگیر پائی۔

حاشیہ میں اس کا مطلب اسطرح درج ہے "یعنی میرے پیر پورے سپاہی ہیں۔ خدا کے نام کا پروانہ لکھا کر ابھی جاگیر (دہلی) لے کر گو ستم گر کہا اگر سہو قلم نہیں تو بہت بڑی غلطی ہے۔ رضا

یہ مسودہ مولانا اسماعیل میرٹھی کی تحریر ہے (ص ۲۵۸ - ۲۵۹)

اس تذکرہ میں 'ارشادات' کی نوعیت بھی عجیب ......

وغریب ہے۔ ممکن ہے وہ (اسماعیل میرٹھی) بعض باتوں کو پسند نہ کرتے

ہوں۔ وہ ملک میں ممتاز شاعر اور معزز معلم کی حیثیت سے اپنا

وقار قائم کر چکے تھے۔ تذکرۂ غوثیہ کی بعض دلچسپ روایات ان کی

سنجیدگی اور اعلیٰ مذاق کے معیار پر پوری نہیں اتر سکیں۔ (ص ۲۵۹)

(تذکرۂ غوثیہ کے ایک) مقام پر مرقوم جتنے اشعار ہیں

وہی کلیاتِ اسماعیل میں فارسی) - کلام کے ساتھ درج ہیں۔

اس طرح، قصیدہ در مدح پیر و مرشد، پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔

(کلیات اسماعیل۔ مرتبہ محمد اسلم سیفی کے) فٹ نوٹ میں لکھا ہے۔

'مولانا سید گل حسن مولانا (اسماعیل) میرٹھی کے پیر بھائی تھے

اس نظم میں ان کا نام ڈال دیا ہے۔''

مندرجہ بالا تمام تحریروں میں گویا ثابت کیا گیا ہے کہ تذکرۂ غوثیہ شاہ گل حسن قادری کی نہیں بلکہ مولانا اسماعیل میرٹھی کی تصنیف ہے۔ ثبوت یہ ہیں

(ا) حیات وکلیات اسماعیل مطبوعہ ۱۹۳۹ء میں مولانا اسماعیل میرٹھی کے چھوٹے صاحبزادے محمد اسلم سیفی نے تذکرۂ غوثیہ کو اپنے والد مرحوم سے منسوب کیا ہے۔

(ب) ڈاکٹر سیفی پریمی نے کتاب کا اصل مسودہ مولانا اسمٰعیل مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ہے۔ جس کے بعض صفحات پر (بقول ڈاکٹر سیفی پریمی) سید گل حسن شاہ کی تحریر بھی ہے اور بقول جناب مالک رام اس اصل مسوّدے کے دیکھنے کے بعد کوئی شبہ ہی نہیں رہ سکتا کہ کتاب مولانا اسمٰعیل کی لکھی ہوئی ہے۔

(ج) سید گل حسن شاہ جس خطّہ' ملک کے رہنے والے تھے وہاں کی زبان کا اس سے کیا تعلق جو اس کتاب (تذکرۂ غوثیہ) میں استعمال ہوئی ہے

(د) تذکرۂ غوثیہ میں بعض اشعار وہی ہیں جو کلیاتِ اسماعیل میں ہیں۔

(ر) قصیدہ در مدحِ پیر و مرشد، میں بقول محمد اسلم سیفی (خلف مولانا اسماعیل میرٹھی) مولانا اسماعیل میرٹھی نے اپنے پیر بھائی ہونے کی وجہ سے مولانا سید گل حسن کا نام ڈال دیا ہے۔

ان پانچ ثبوتوں میں (د) اور (ر) کے راوی محمد مولانا اسماعیل میرٹھی کے چھوٹے صاحبزادے محمد اسلم سیفی میرٹھی ہیں، اور یہ سب کچھ تذکرۂ غوثیہ کی پہلی اشاعت کے ۵۵ سال بعد اور مولانا اسماعیل میرٹھی کی وفات کے ۲۲ سال بعد لکھا گیا۔ مولانا نے اپنی زندگی میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا جس سے معلوم ہو کہ تذکرۂ غوثیہ گل حسن شاہ کی تصنیف نہیں بلکہ خود ان کی اپنی ہے۔ ان کا لکھا ہوا قطعۂ تاریخ ملاحظہ فرمایئے [1]

حسن بنوشت ملفوظاتِ مرشد	بدلہا ریختہ انوارِ توحید
کتابِ مستطابِ لاجوابے	ہمانا ابرِ گوہر بارِ توحید
بہ بیں در ہر اشارات می زند جوش	محیطِ اعظم زخارِ توحید
قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید	بہ حیرانی یوالعجب درکارِ توحید
چو از توحید دیدم شرحِ اسرار	بگفتم آیتِ اسرارِ توحید

قطعے کے چوتھے شعر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ خود مولانا اسماعیل اپنے مرشد کے ارشادات کی صداقت کے قائل تھے۔ اس لئے ڈاکٹر سیفی پریمی کا یہ کہنا کہ، ممکن ہے تذکرۂ غوثیہ کے عجیب وغریب ارشادات انھیں پسند نہ ہوں، اور یہ ان کی سنجیدگی اور اعلیٰ مذاق پر پورے نہ اترتے ہوں اس لئے انھوں نے تذکرے کو شاہ گل حسن کے نام کر دیا، محض مفروضہ ہے۔ اور پہلے مصرع میں تو مولانا نے صاف لکھ دیا ہے کہ ملفوظاتِ مرشد (تذکرۂ غوثیہ) حسن (گل حسن شاہ) نے لکھا ہے۔ تمام دوسرے تاریخ گویوں نے بھی (جن کی تعداد ایک درجن سے کم نہیں) اسے گل حسن شاہ ہی سے منسوب کیا ہے۔ مولانا اسماعیل کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ پھر ان تاریخ گویوں میں کئی ان کے پیر بھائی ہیں۔ کیا ان میں سے کسی ایک کو بھی معلوم نہ تھا کہ یہ کتاب مولانا اسماعیل

---

[1] دیکھئے تذکرۂ غوثیہ مطبوعہ ۱۸۸۴ء ص ۵۳ تا ۶۰

میرٹھی کی تصنیف ہے۔ اور گل حسن شاہ کا نام تو برائے نام ہی ہے۔ جیسا کہ مولانا کے چھوٹے بیٹے کو مولانا کے انتقال کے ۲۲ سال بعد، بتانا پڑا کہ یہ تالیف ان کے والد کی ہے گل حسن شاہ کی نہیں۔

اب ذرا مولانا کے چھوٹے صاحبزادے محمد اسلم سیفی صاحب کا معیار تحقیق بھی دیکھ لیجئے۔ حیاتِ اسمٰعیل (ص ۹ بحوالہ تلامذۂ غالب ص ۳۳) میں لکھتے ہیں۔

"اس زمانے کا ذکر ہے کہ مرزا غالب نے قاطع برہان کے نام سے ایک رسالہ برہان قاطع کے خلاف شائع کیا تھا۔ یہی وقت تھا کہ مرزا رحیم بیگ کے مکتب میں مولانا (اسماعیل میرٹھی) متعلم تھے مرزا رحیم بیگ نے مرزا غالب کی قاطع برہان کے جواب میں ایک رسالہ ساطع برہان تصنیف کیا تھا۔ مولانا (اسماعیل میرٹھی) کے سپرد یہ خدمت تھی کہ مختلف کتب لغات سے الفاظ تلاش کرتے اور ان کے معانی سناتے رہیں۔ اور کبھی کبھی مسودات بھی تحریر کیا کریں"۔

اسی حیات اسمٰعیل میں محمد اسلم سیفی نے لکھا ہے کہ ۱۸۶۰ء میں مولانا انسپکٹر مدارس کے دفتر میں کلرک کی حیثیت سے ملازم ہو چکے تھے۔ لیکن مرزا غالب کی کتاب قاطع برہان تو پہلی بار ۱۸۶۲ء میں چھپی۔ اس وقت ان کا مرزا رحیم بیگ کے مدرسے میں طالب علم ہونا چہ معنی۔ اور قاطع برہان کے جواب میں ساطع برہان تو اس کے بعد چھپی۔ گویا محمد اسلم سیفی کے اس بیان کے غلط ہونے میں کوئی شک نہیں۔

ایک نظر خود تذکرہ غوثیہ پر ڈال لینا بھی ضروری ہے۔ گل حسن شاہ خاتمۃ الطبع از مولف[1] میں فرماتے ہیں۔

"جب حضرت قبلہ و کعبہ (غوث علی شاہ قلندر) کے اندوہ و فراق نے اس جانب طبیعت کو مائل کیا کہ ملفوظات گرامی کی تحریر کا مشغلہ اختیار کر تو اس امر اہم کی مشکلات نے ڈرایا کہ نہ تو منشی ہے۔

---

[1] تذکرہ غوثیہ۔ مطبوعہ ۱۸۸۴ء ص ۵۰۴ تا ۵۰۳۔

نہ مولوی، نہ صوفی نہ مشائخ، یہ کارِ سترگ مجھ سے کس طرح سرانجام ہوگا..... لیکن ...... کمرہمت کو چست باندھا اور قلم اٹھایا ...... دوسرے روز ایک جزو کتاب کا لکھ کر منشی فضل رسول صاحب کو سنایا۔ نہایت پسند کیا، اور باصرار تمام فرمایا کہ ضرور اس کو پورا کرو۔ تمام برادرانِ طریقت پر تمہارا احسان ہوگا۔ اور یہ کام سوائے تمہارے کوئی اور نہیں کر سکتا، کیونکہ جناب و قبلہ کی خدمت میں عرصہ دراز تک شرف صحبت و عز تربیت اس قدر کسی کو میسر نہیں ہوا۔ غرض کہ ہمیشہ اس کام کی ترغیب و تاکید اور اس کے انجام دینے کی نسبت اصرار و تقاضائے شدید فرماتے رہے یہاں تک کہ سال کے عرصہ میں کتاب تیار ہوگئی .... "

پھر گل حسن شاہ کو انطباع کتاب کی فکر ہوئی، مگر استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے یہ کام ملتوی ہوگیا۔ ایک دن علی الصباح نکل کھڑے ہوئے تاکہ اوچہ شریف پہنچ کر اپنے مرشد کے آبا و اجداد کے سلسلۂ نسبی کی تحقیق کریں۔ امرتسر، لاہور ہوتے ہوئے شاہ پور پہنچے۔ وہاں سے ڈیرہ غازی خاں، ملتان، بہاولپور اور احمد پور شرقیہ ہوتے ہوئے چار مہینے کے بعد اوچہ شریف پہنچے۔ وہاں مزار شریف پر بیٹھا تھا کہ نیند آگئی۔ بشارت ہوئی کہ

"بہت جلد میرٹھ جاؤ وہاں تمہارا انتظار ہے، اور انطباعِ کتاب منشی نجم الدین کا حصّہ ہے۔ میں نے اس روز وہاں قیام کیا اور اس خاندان شریف کے ...... امور ...... معلوم و تحقیق کر لیے۔ دوسرے روز عالم رویا میں پھر وہی اشارہ ہوا.... تیسرے روز وہاں سے چل دیا..... بہاول پور میں مرزا اکبر بیگ صاحب کے پاس پہنچا وہاں منشی نجم الدین صاحب کا خط ملا اور جو اشارہ مجھ کو ہوا تھا اس کی بالکل تصدیق ہوگئی۔ چند روز میں میرٹھ آگیا اور طبعِ کتاب کا تہیہ ہوگیا .... بفضلہ تعالیٰ طبع کتاب کا کام بخیر و خوبی اختتام کو پہنچا جن احباب

کو انطباع کی تمنا تھی ان کے واسطے یہ ہدیہ موجود ہے۔"

ص ۷۴۴ پر گل حسن شاہ کی یہ تحریر بھی دیکھیے۔

"پھر مولوی محمد اسمٰعیل (میرٹھی) صاحب دوست ہمرنگ منشی

نجم الدین سے (مجھے) الفت ہوئی۔ جناب و قبلہ (غوث علی شاہ)

ان (مولانا اسمٰعیل) کے حق میں فرمایا کرتے تھے 'اسمٰعیل فرشتہ

ہے ہر وقت سکوت' کے عالم میں رہتا تھا۔

کیا مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے اوپر کی تمام باتیں بھی گھڑلیں یا اوچہ شریف وغیرہ کا سفر مولانا نے خود کیا تھا؟ اور پھر غوث علی شاہ صاحب کا اپنے بارے میں تعریفی ارشاد بھی انہوں نے خود ہی درج کر لیا جبکہ ان کی طبیعت (بقول جناب مالک رام) فطری طور پر نیک تھی۔ اور غوث علی شاہ کی بیعت نے اسے نیک تر کر دیا تھا؟۔

ص ۵۶۴ پر حافظ محمد اکبر (خادم ازلی و معتقد ولی حضرت ..... شاہ گل حسن قادری مولف تذکرۂ ہذا) کے دو قطعات تاریخ درج ہیں۔ ایک قطعے کے آخری چار شعر دیئے جاتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرۂ غوثیہ کے اس اشاعتِ اوّل کے کاتب بھی یہی ہیں۔ ؎

"ہے وہ حسینی و حسنی از رہِ نسب!! | باغِ حسن کا گل ہے وہ اور گل حسن ہے نام
جس کے ہر ایک لفظ سے راحت ہے روح کو | ہر حرف سے ہے غنچۂ خاطر کو ابتسام!
لکھوایا مجھ سے نسخۂ اوّل کتاب کا!! | کافی ہے میرے واسطے یہ فخر تا دوام!
جب ختم کر چکا اسے اکبر نے یوں کہا!! | ابرِ بہارِ فیض ہے تاریخِ اختتام

دوسرے قطعۂ تاریخ کے دو شعر بھی ملاحظہ کیجیے ؎

بجا ہی ہے مگر حضرت سلامت تم نہیں واقف | کہ سید گل حسن سے مجھکو روحانی ارادت ہے
میں اس تالیف کو ان کی شفائے جاں سمجھتا ہوں | یہی میری عبادت ہے یہی میری سعادت ہے

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ محمد اکبر جو اس کتاب کے کاتب اول تھے اور گل حسن شاہ کو اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے وہ بھی بلاشبہ تسلیم کرتے ہیں کہ تذکرۂ غوثیہ گل حسن شاہ ہی کی تالیف ہے۔

مزید یہ کہ اگر مولانا اسمٰعیل میرٹھی (بقول ڈاکٹر سیفی پریمی) اپنے پیر بھائی

کی پردہ داری کرنا چاہتے تھے اور اخلاقاً حقیقت کو بے نقاب کرنے سے گریز کرتے تھے تو انہوں نے اپنے ہاتھ کے مسوّدے کو ضائع کیوں نہیں کیا ؟ کیا انھیں اپنے پیر بھائی سے اپنی زندگی تک ہی ارادت تھی؟

رہی بات (ب) کی یعنی مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسوّدہ جناب مالک رام اور ڈاکٹر سیفی پریمی نے بچشم خود دیکھا ہے، تو یہ بات کتاب کے صحیح مصنّف یا مؤلف کی نشاندہی کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ مجھ پر ڈاکٹر گیان چند صاحب نے ایک مضمون لکھ کر مجھے بھیجا تھا۔ میں نے اس کی نقل اپنے ہاتھوں سے کر کے اصل مسودہ چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ اب وہ میری اور ڈاکٹر گیان چند کی زندگی میں (پورا امکان ہے) چھپ بھی جائے گا۔ اگر ہم دونوں کے بعد اصل مسوّدہ گم ہو جائے مگر میرے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ (جو دراصل نقل ہی) مل جائے تو کیا اس مضمون کو میری تصنیف مان لیا جائے گا ؟۔

(ج) اور (د) کہ سید گل حسن شاہ جس خطۂ ملک کے رہنے والے تھے وہاں کی زبان کا تذکرۂ غوثیہ کی زبان سے کیا تعلق اور یہ کہ تذکرۂ غوثیہ میں بعض اشعار مولانا اسمٰعیل میرٹھی کے ہیں، بھی نہایت ضعیف دلیل ہے۔ اوّل تو یہ کہ میرے سامنے گل حسن شاہ کی کوئی جداگانہ نظم و نثر نہیں ہے جس سے تذکرۂ غوثیہ کا موازنہ کیا جاسکے۔ دوم کسی دوسرے کے اشعار اپنی تالیف میں استعمال کرلینا ایک عام بات ہے۔

بہرحال اگر یہ سچ بھی ہے تو محض اس حد تک کہ تذکرۂ غوثیہ گل حسن شاہ قادری ہی کی تصنیف ہے۔ اور اس میں مولانا اسمٰعیل نے زبان و بیان کے لحاظ سے ترامیم کی ہیں۔ اور جو مسوّدہ آجکل مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا پایا جاتا ہے وہ اصل ترمیم شدہ مسوّدے کی صاف شدہ کاپی ہے۔ ورنہ (بقول ڈاکٹر سیفی پریمی) اس آخری اور قلمی مسوّدے پر بھی کہیں کہیں گل حسن شاہ قادری کے ہاتھ کی عبارت کیوں ہوتی جبکہ تمام کتاب کو مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی تصنیف قرار دے دیا گیا ہے۔

(۳) تذکرہ غوثیہ کا پہلا ایڈیشن "خاتمۃ الطبع از مؤلف" کے مطابق ۱۴ر شعبان ۱۳۰۱ھ مطابق ۹ر جون ۱۸۸۴ء کو چھپا۔ اس کا دوسرا نام شجرۂ معرفت تھا جس سے ۱۲۹۸ھ برآمد ہوتا ہے اس سنہ سے گل حسن شاہ کا قول درست ثابت ہو جاتا ہے کہ ایک سال کے عرصہ میں کتاب

تیار ہوگئی۔ گویا ۱۲۹۸ھ کتاب کے مکمل ہونیکا سال ہے اور ۱۳۰۱ھ کتاب کے چھپنے کا سال ہے۔

سرورق کی عبارت (عربی آیات کو چھوڑ کر) یہ ہے۔

"حالات بابرکات و ملفوظات طیبات حضرت مولانا سید غوث علی شاہ قلندر قادری قدس سرہ الموسوم بہ شجرۂ معرفت ۱۲۹۸ھ

تذکرۂ غوثیہ

تالیف شریف مولوی شاہ گل حسن صاحب قادری خادم طریق و وصی بالتحقیق حضرت مولانا موصوف

کہا دیکھ کر اس کو اہلِ سخن نے — لکھا شجرۂ معرفت گل حسن نے

"در مطبع فاروقی باہتمام محمد معظم"

کل صفحات ۴۰۶ ہیں (اس کے علاوہ ۱۰ صفحوں کا صحت نامہ ہے)

پھر لکھا ہے کہ " دہلی بازار دریبہ کلاں، مکان لالہ مکھن لال تاجر کتب سے طلب فرماویں"

دوسرا ایڈیشن ماہ مارچ ۱۹۱۱ء میں چھپا۔ تمام سرورق بدل دیا گیا ہے۔ شروع کی ایک سطری عربی عبارت کے علاوہ سرِ ورق یوں ہے۔

"حالات بابرکات و ملفوظات طیبات سیاح دشت تجرید و سباح دریائے توحید حضرت مولانا سید غوث علی شاہ قلندر قدس سرہ (پانی پتی) مسمّٰی بہ

تذکرۂ غوثیہ

(نو ترمیم)

واسم تاریخی

شجرۂ معرفت

مع

ضمیمۂ جدیدہ

حسب اجازت واقِفِ اِسرارِ طریقت حضرت مولف مولوی شاہ گل

حسن صاحب قادری خلیفۂ خاص و وصی بالاختصاص حضرت

مولانا مرحوم سلمہم اللہ تعالیٰ باہتمام احقر انام محمد عبدالاحد غفرلہ الصمد

بماہ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۱۱ء

در مطبع مجتبائی واقع دہلی طبع گردید

(کاپی رائٹ بنام حضرت مولف بذریعہ رجسٹری باضابطہ محفوظ ہے)"

اس ایڈیشن میں نمایاں تبدیلی یہ ہے کہ صفحے ۴۵۶ رہ گئے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ بیس صفحہ کا ضمیمہ لگا دیا گیا ہے۔ مولف کے کہے ہوئے قطعہ تاریخ کے سوائے تمام قطعات تاریخ حذف کر دیئے گئے ہیں۔ اس ضمیمے میں اس دعویٰ استقرار حق کا مفصل ذکر ہے۔ جو گل حسن شاہ نے درگاہ مولوی غوث علی شاہ کی طرف سے افغانانِ پانی پت کے خلاف دائر کیا تھا۔ آخر میں لکھا ہے "...... شائقین مطبع مجتبائی دہلی سے طلب فرماویں"۔ یہ ایڈیشن پہلے ایڈیشن کے ستائیس سال بعد شائع ہوا۔ یہی دو ایڈیشن ہیں جو مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی زندگی میں نکلے تیسرا ایڈیشن مولانا اسمٰعیل میرٹھی کے انتقال کے ۱۰ برس بعد نکلا۔ سرورق کی پہلی فارسی عبارت تقریباً وہی ہے۔ صرف قلندر کے بعد قادری کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اور (پانی پتی) کے بعد رحمۃ اللہ لکھ دیا گیا ہے۔

مسمّٰی بہ

تذکرہ غوثیہ

بارسوم ترمیم و اضافہ کردہ

اسم تاریخی

شجرۂ معرفت

مع

ضمیمہ و دستور العمل درگاہ شریف

حسب فرمان واقفِ اسرارِ طریقت و معرفت حضرت مولانا شاہ

گل حسن صاحب قلندر قادری مؤلف کتاب و خلیفہ خاص و وصی

بالاختصاص حضرت مولانا موصوف قدس سرہٗ جے اینڈ سنس

برقی پریس دہلی میں ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۸ء کو قاضی محتشم الدین

احمد صاحب نے بسعیٔ خود طبع کرایا"

اس ایڈیشن کے کل صفحات ۴۸۴ ہیں۔ متن دوسرے ایڈیشن کی طرح ۴۵۶ صفحہ پر

ختم ہوجاتا ہے۔ مگر اس ایڈیشن میں سات صفحے" دستور العمل و ضوابط خانقاہ .....

مجوزہ حضرت شاہ سید گل حسنؒ کے اور ضمیمے کے صفحات جواب تقریباً اکیس ہوگئے

ہیں، شاملِ متن کر دیئے گئے ہیں یعنی (۴۵۶ + ۲۱) ۴۸۴ صفحات۔

(۴) حیاتِ اسمٰعیل (۱۹۷۶ء) از ڈاکٹر سیفی پریمی میں (۲۷۴ - ۲۷۵)

پر لکھا ہے کہ تعلیم غوثیہ بھی تذکرۂ غوثیہ کی طرح ایک اہم تالیف ہے۔ "تعلیم غوثیہ کی

اشاعت ۱۹۱۹ء میں ہوئی تھی اور وہ مولانا سید گل حسن شاہ کے نام سے چھپی تھی۔ قاضی

محتشم الدین احمد نے جے اینڈ سنسز برقی پریس دہلی سے چھپوا کر شائع کی تھی"۔

دوسرے ایڈیشن کے آخر میں تعلیم غوثیہ کا اشتہار موجود ہے۔

(تذکرۂ غوثیہ مارچ ۱۹۱۱ء ضمیمہ ص ۲۰) یہ مؤلف کتاب ہذا یعنی گل حسن شاہ کی

طرف سے ہے:-

"کتاب تعلیم غوثیہ مرآۃ الوحدت بھی تیار ہو چکی ہے

عنقریب شائع ہوجائے گی"۔

تیسرے ایڈیشن کے آخر میں بھی اعلان موجود ہے (تذکرۂ غوثیہ ۱۹۱۸ء ص ۴۸۴)

اعلان

"کتاب تعلیم غوثیہ مرآۃ الوحدت بھی زیرِ طبع ہے۔ آخر ماہ

صفر تک مکمل ہوگی۔ جن صاحبان کو مطلوب ہو منگالیں۔

درجہ اوّل آرٹ پیپر مجلد ....

درجہ دوم اعلیٰ کاغذ دیگر قسم پر ...... ہر ایک کتاب کے
اندر ایک مرقع خلیفۃ اللہ رنگین طلائی بش قیمت لگا ہوا
ہے ۔ ملنے کا پتہ: قاضی موتمن الدّین ۔ کوچہ سعداللہ خاں
دریا گنج دہلی ....۔"

تذکرہ غوثیہ کے پہلے تینوں اڈیشن میرے کتب خانے میں موجود ہیں
مگر تعلیم غوثیہ کا کوئی نسخہ میرے یہاں نہیں ہے ۔ اور کہیں اور جگہ بھی نہیں مل
سکا ہے ۔ اس لئے فی الحال اس پر مزید کچھ کہنے سے احتراز کیا جاتا ہے ۔

مکتوباتِ شوکت شاگردِ غالب

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

نواب یار محمد خاں شوکت[1] کے والد نواب فوجدار محمد خاں کے غالب سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ غالب کے قدیم اردو کلام کا مجموعہ نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا تھا، انھیں کے کتب خانے سے ملا تھا۔

غالب کی ضعیفی کا زمانہ تھا کہ فوجدار محمد خاں، جوان شوکت کو ان کی خدمت میں لے گئے۔ ظاہر ہے تعلقات کی بنا پر غالب انکار نہ کر سکے ہونگے اور انہوں نے شوکت کو اپنا شاگرد بنالیا۔ چنانچہ اپنی تالیف "انشائے نورِ چشم ۱۲۸۹ھ" کے ص ۴۶ پر شوکت لکھتے ہیں۔

"نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ دہلوی، المتخلص بغالب ...... ثانیٔ ظہیر و ظہوری تھے، دوم ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ دہلی میں راہی ملک بقا ہوئے۔ جناب ممدوح کے صدہا شاگرد رشید ہیں۔ سب سے کمتر یہ راقم آثم ہے...."

شوکت کا مقام بلحاظ شاعری یا نثر نگاری کچھ بھی ہو مگر بھوپال کی علمی اور ادبی زندگی میں ان کا ایک خاص مقام رہا ہے۔ انھوں نے اہلِ علم و فن کی جو قدر دانی کی وہ بھوپال کی ادبی تاریخ کا ایک مستقل باب بن گئی ہے۔ متعدد شعراء ان کی ڈیوڑھی سے وابستہ تھے۔ ہر ہفتے بزم شاعری کا انعقاد ہوتا تھا۔ انعام و اکرام کی بارش برستی رہتی تھی اور گلزارِ علم و ادب ہمہ وقت کھلا رہتا تھا۔ ظاہرا انھیں فیاضیوں کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے جاگیردار ہونے

---

[1] ولادت ۱۶ر جولائی ۱۸۳۳ء — وفات ۱۸ر اگست ۱۹۱۳ء

کے باوجود مقروض رہتے تھے۔ مگر مقروض رہنے کی ایک خاص وجہ ان کے معاشقے اور رنگ رلیاں بھی ہوسکتی ہیں، جن کا بیان یہاں مقصود ہے۔

میرے کتب خانے کے غالب گلکشن میں شوکت کی چار کتابیں، دیوانِ شوکت، انشائے نورِ چشم، تذکرہ فرح بخش اور گلدستۂ نرگس، مطبوعہ ہیں۔ مگر ایک کتاب قلمی بھی ہے، اس کا نام تو معلوم نہیں کیونکہ اس کے شروع کے ۶۴ صفحات غائب ہیں۔ مگر اتنا قطعی ہے کہ یہ شوکت کے مکتوبات کا مجموعہ ہے، یہ مجموعہ کسی ایسے کاتب کا نقل کردہ ہے جو پرانے ڈھنگ کے پختہ نستعلیق خط اور املا میں طاق ہے، مگر ہجّے کی غلطیاں بہت کرتا ہے۔ پہلے یہ ۲۰۸ صفحوں کو محیط تھا بعد میں شوکت نے اپنے قلم سے اس میں ۹ صفحوں کا اضافہ کیا اس طرح خانہ ساز کاغذ کے کل ۲۱۷ صفحے ہوئے مگر پہلے ۶۴ گمشدہ صفحوں کو کم کر کے اب صرف ۱۵۲ صفحے باقی ہیں۔ یا یہ کہ کل ۴۹ خطوں میں سے پہلے ساڑھے گیارہ خط (بارہویں خط کا صرف کچھ حصہ ضائع ہوا ہے) غائب ہیں۔ لہٰذا تمام اقتباسات باقی ماندہ ۳۷ خطوں ہی سے اخذ کئے گئے ہیں۔

خطوں میں صرف ایک خط کے آخر میں ۱۲۸۸ھ (البدت ششم شہر صفر المظفر) درج ہے۔ جس سے کچھ اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ خطوط تیرھویں صدی ہجری کے آخری چوتھائی میں لکھے گئے ہیں۔ ورنہ کسی خط پر کوئی تاریخ وغیرہ نہیں ڈالی گئی۔ یار محمد خاں کا نام چار جگہ آیا ہے۔ اشعار میں ایک جگہ شوکت تخلص درج ہے اور کہیں کہیں آخری صفحات کے اشعار میں شوکت نے اپنے شعروں پر اصلاح بھی دی ہے۔ تین جگہ شوکت کی تصانیف "فرح بخش" جسے کاتب نے غلطی سے "فرو بخش" لکھدیا ہے اور "گلدستۂ نرگس" کا ذکر آیا ہے۔

ان ۳۷ خطوں کی تفصیل یہ ہے:۔

۷ خط از جانب سرکار دولتمدار (یار محمد خان شوکت) بنام فرحت جان
۵ خط " " " (" ") بنام مُنّا جان
۱ خط " " " (" ") بنام گھسیٹی وکیر طوائف
۱ خط " " " (" ") بنام عمدہ جان طوائف

۱ خط 〃 〃 〃 (〃 〃 〃) بنام گیتی آراء بیگم

۱ خط 〃 〃 〃 (〃 〃) بنام مکتوب الیہ کا نام نہیں

۱ خط 〃 〃 〃 (〃 〃) بنام محبوب جان

۴ خط فارسی میں ہیں جو شوکت نے محض انشاء پردازی کے لئے رقم کیے ہیں۔

۲ خط فارسی زبان میں ہیں اور ذاتی ہیں۔ مگر مکتوب علیہ کا پتہ نہیں چلتا۔

۱ خط گھیٹی وکیسر طوائف بنام شوکت

۱ خط منا طوائف بنام شوکت

۱۱ خط طوائفوں کی طرف سے بنام شوکت

۱ خط نظم میں شوکت کا طبع زاد (عنوان ہے بڑھی کنچن کا نامہ بنام دختر علامہ)

کل ۳۷ خط

چونکہ نامہ و پیام طوائفوں اور نواب یار محمد خان شوکت کے درمیان ہے اس لئے خطوط میں مخش کلمات بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ جنھیں یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کلمات کی عدم شمولیت سے اور غیر ضروری طویل القاب اور عبارتیں حذف کر دینے سے خط کچھ سپاٹ سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ مگر ایسا کیے بغیر چارہ نہ تھا۔

خطوط شوکت بنام فرحت جان:- (۱) ..... یک قطعہ خط

فرحت نمط بدست خیاط کے نزدیک ہمارے آیا۔ مندرجہ معلوم ہوا.....

افسوس ہیہات مانوجی نے چھڑایا تھا تمہارا ہمارا سنگ ساتھ ـــ تمہاری ماں سے دھوکا پا چکا ہوں، سنبھل بیٹھا ہوں۔ بموجب مثل کے دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک پیتا ہے۔ ماشاءاللہ چشم بد دور چہرہ بے نظیر صورت دل پذیر ہے؛ جمال تمہارا سحر سامری کا نمونہ، مہ و مہر سے دونا، عابد کش زاہد فریب ہے۔ دل ہمارا بھی لوٹ پوٹ ہے۔ پر کیا کیا جاوے ؎

کیا تنِ نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے

کیا بدن کا رنگ ہے، تہ جس کے پیراہن پہ ہے۔

جو تمہیں اپنی محبت دکھانا ہے۔۔۔۔ تو آؤ یہ غریب خانہ تمہارا گھر ہے ؎

وہ نہیں ہوں کہ پھروں تیری وفاداری سے
قتل گر لاکھ کرے مجھکو جفا کاری سے

۔۔۔۔ جس دن سے۔۔۔۔ جگر میں خارِ ہجراں چھوڑکر ادھر روانہ ہوئی ہو اس دن سے میں پر ملال اپنی بے قراری۔۔۔۔ کا حال کیا تقریر کروں ؎

دن کٹا فریاد سے اور رات نہ زاری سے کٹی
عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری سے کٹی!!

۔۔۔۔ ہماری طرف سے تمہاری والدہ کو مبارک باد دینا اور کہنا کہ تم نے اپنا نکاح عمرِ پیری میں پڑھالیا، مگر ہمارا رشتۂ محبت فرحت جان سے تڑا دیا۔ یہ وہ مثل ہوئی" بڑھاپے کے چوچلے جنازے کے ساتھ" کوئی شخص اس عمر میں ایسی بات کرتا ہے۔ ماہ بماہ کا ساتھ چھڑاتا ہے۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ تمام مردمانِ فائق بھوپال کی گفتگو۔۔۔۔ ہے کہ میاں فیض محمد خاں صاحب کے یہاں مانو جی آتی ہیں۔ اور ہم کو خط لکھ کر بھجاتی ہیں۔ اور یہ ہمارے ملازموں کا سفال ہے۔۔۔۔ مثل مشہور ہے۔

مشہور ہے شیطاں جہاں میں استاد
پر ہاتھ سے عورت کے کرے ہے فریاد

۔۔۔۔۔ ہم کیا کہیں تم ہی دل میں سمجھو ہماری محبت اور روپیوں کا دینا جانو۔۔۔۔ خیر تمہاری محبت یاد آتی ہے، ملازمین سمجھاتے ہیں، تمہاری ماں نہیں مانتی ہیں، انھیں سمجھا کر چلی جاؤ فقط۔ مورخہ لبست ششم شہر صفر المظفر ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۲۷۹ فصلی

(۲) ۔۔۔۔۔ دو قطعہ خط بدست مسمی امیر کے نزدیک ہمارے پہنچے حال۔۔۔ معلوم ہوا۔۔۔۔ تم نے جو خط محبوبانہ اور مکتوب عاشقانہ تحریر کیا، لاریب ہے ہم کو بھی جواب اس کا۔۔۔۔ بطرز مشتاقانہ لکھنا ضروری ہے۔ زبانی وزیر کی جو سُنا، تمہارے حال سے خوب واقف ہوئے، تم ہی لیلیٰ ہو رہی ہو، مجنوں کو ڈھونڈ رہی ہو، کچھ پروا یہاں نہیں اور یہ جگہ آپکی قدیم ہے۔۔۔۔

عالم محبت میں ہم معذور ہیں۔۔۔۔ مگر آپکی ماں سے مجبور ہیں اس کی بدکرداری سے

چکنا چور ہیں ..... آؤ یہ گھر تمہارا ہے ..... بہکانے میں کسی کے نہ آؤ، روپیہ پیسہ
کا ذکر مت لاؤ، ہم کو زر سمجھو، بے دھڑک تشریف لاؤ .....
اس کے بعد پانچ خط فارسی میں ہیں۔ پہلے صرف یہ یقین دہانی کی گئی ہے کہ اگر تم
آجاؤ تو تمہیں وہی تنخواہ اور وہی مرتبہ دیا جائے گا اور یہ کہ تم پہلے سے بھی زیادہ عزیز رکھی
جاؤ گی ..... پھر کہتے ہیں۔
کہ دعوائے محبت کا کرنا اور پیسے مانگنا کہاں کی "شانِ دوستی" ہے۔ آگے چل کر
لکھا ہے کہ اگر تم آنا چاہتی ہو تو تمہیں آنے پر صرف کرایہ دے دیا جائے گا۔ خرچ وغیرہ کیلئے
کچھ بھیجا نہیں جائے گا۔ (برائے ارسال خرچ از اینجانب استدعا نا منظور)" آخر میں ہے۔
کہ خرچ طلب کرنا تم لوگوں کی فطرت ہے۔ ورنہ بھوپال سے سیہور دور نہیں ہے اور ہمارے دل میں
سرِ مو فتور نہیں ہے۔ (معلوم ہوتا ہے فرحت جاں سیہور کی رہنے والی تھی)۔

خطوط شوکت بنام فرحت جان

(۱) ہم آپکو چودہ چکنیاں کتھا کب وعدہ؟
اپنے شہر کا تحفہ آپ کو دیتے ہیں۔ بہت آپ کو یاد کرتے ہیں ..... کس مصیبت میں جان
پڑی ہے، بڑی قیامت ہے، سخت مشکل ہے، ..... کڑی منزل ہے، ہم وہاں آ نہیں
سکتے تم کو یہاں لا نہیں سکتے، پچھلا دن ہے، ضعیفی کا سن ہے ..... کوئی اس عمر
میں بھی اپنا ہوش کھوتا ہے ..... عجب ماجرا ہے ..... کہیں تو سننے والے کا بھی جی
گھبرائے، چپ رہے تو کلیجہ منہ کو آئے ..... اس دن بازار میں (ہم) ایسے شرمائے کہ
تم نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا (آپ) کہیں اور ہم نہ آئے۔ مزا یہ ہے کہ ایک آدمی ساتھ
لائے تھے۔ تمہارا گھر پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ یکبارگی سب بھول گئے۔ بدن سنسنا گیا۔
ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ دن تھا، رات نہ تھی، نہیں یہ تو کچھ بات نہ تھی۔
(۲) ..... تمہارے چند خط مسرت نمط قبل سفر بمبئی اور بعد مراجعت
آئے۔ اور رنگیں باتوں اور حسن عبارت کے خوب لطف اٹھائے ..... سچ تو یوں ہے کہ
ایسے لوگ بھی جو فقط زبان قلم سے اظہار اتحاد و یکدلی کریں ..... بہت کمیاب ہیں۔

اور جن کے بیان سے نقل ہمرنگ اصل ہو۔ وہ بھی انتخاب ہیں۔ واقعی لشکر گوالیار نے بھوپال کے کان کاٹے ہیں کہ ہر خط میں نئے فقرے چھانٹے ہیں۔

...... معشوقانہ شرارت کا کیا کہنا؎

خوش رہو دکھا ہری جان جہاں رہتی ہو

ہر جگہ تحریر محبت سے یہی ٹپکتا تھا کہ کوئی اگر ہمیں جھولٹوں بلاویں تو سیجوں چلے آئیں......

اور ہی دل چاہے تھا میں نہ تجھ سے کہتا تھا
عشق ہے دام بلا میں نہ تجھ سے کہتا تھا
پاس خوباں کے نہ جا، میں نہ تجھ سے کہتا تھا
ان کی باتوں میں نہ آ، میں نہ تجھ سے کہتا تھا

یہ تو فرمائیے کہ آپ بیٹھے بٹھلائے اندوہ کا جذبہ پیدا کرنا، بن موت مرنا، ایڑیاں رگڑنا، مفت کی پشیمانی اٹھانا، خاطر غمزدہ، مصیبت کشیدہ کو بساطِ ماتم پہ بٹھانا کس مذہب میں روا ہے؎

یا رب اندوہ و مصیبت سے تو مرنا بہتر
گذرے غم جی پہ تو بس جی سے گزرنا بہتر
بحرِ الفت میں قدم کا نہیں دھرنا بہتر
ہے کنارہ ہمیں اس حال سے کرنا بہتر

...... ہم اتنا تو جانتے ہیں کہ تم کب آتی ہو، محض جھوٹی الفت جتاتی ہو، اگر آنا تمہارا مشکل ہے تو یہ تو لکھو کہ تمہارے کون کون سے معشوق لائق کار ہیں اور کون کون گانے بجانے میں ہوشیار ہیں۔ تم نے کس واسطے راہِ خط و کتابت بند کیا ..... خط و کتابت جاری رکھو، تحفہ تحائف یہاں سے منگواتے رہو۔ اور وہاں کے "اشیاء لائق تحفہ" بھجواتے رہو اور ہم بمبئی سے بعض اشیائے لائے ہیں۔ آپکو منظور ہو تو لکھ بھیجو کہ ارسالِ خدمت اس پری پیکر کے کریں۔ سابق میں کتاب تذکرہ "خرد بخش" (فرح بخش) و گلدستۂ نرگس نخفتگا نزدیک تمہارے مرسل ہوئی تھیں۔ رسید ارسال کرو۔ فقط۔

[اس کے بعد ۲ خط فارسی میں ہیں جنمیں ۱۲ عدد قرص کہنہ شکو نقرہ و طلائے برائے بیڑہ پان" بھیجنے کا ذکر ہے اور موصول ہونے کی رسید طلب کی ہے۔]

۵ .... اللہ، اللہ آج کیا دن ہے کہ گلدستۂ محبت بعد انتظار بسیار آیا...

قاصد رسید نامہ رسید و خبر رسید

در حیرتم کہ جاں بکدامی کنم نثار

خط کو جو کھولا، میزانِ نگاہ میں تولا آپکی محبت کو کم وزن پایا۔ کوئی لفظ ہمارے شوقِ دل کے پاسنگ میں بھی نہ آیا۔ مگر چونکہ خطِ یار تھا۔۔۔۔ آنکھوں سے لگایا، سہرے کی طرح سر پر چڑھایا۔۔۔۔۔۔ آپکی طرفہ تحریر ہے، عجوبہ تقریر ہے۔ ایک منزل آئیں ایک بیل فوت ہو گیا، یہ عجب فقرہ زبان پر لائیں، دوسرا بیل خرید کرنا کیا دشوار تھا، ہنڈوی بھیجنی تھی۔ دس بیس روپے خرچ کرنے میں کیا بار تھا۔۔۔۔۔۔ جھوٹے فقرے ہم کو نہ سناؤ ؎

مجھ کو ناداں نہ سمجھ دور ہوں دانا میں ہوں

قوم کی جوہری تو ہے تو سیانا میں ہوں

صاف انبالہ آنے کو تو ہم نے منع کیا۔ بمبئی کو فالِ نیک شگون نے آنے نہ دیا ؎

تمہیں غیروں سے کب فرصت کب اپنے غم سے ہم خالی

چلو بس ہو چکا ملنا، نہ تم خالی نہ ہم خالی

اب بعد محرم آنے کا اقرار ہے، کیونکر یقین ہو،۔۔۔۔۔ آنا ہو تو جلد آؤ۔۔۔۔۔ جو یہ لکھا ہے کہ محبوب جان، نور جہاں، بنو جاں، نواب جان، قابل مصاحبت اُمرا ہیں۔ ان کا عالم شباب ہے۔ یہ فقرہ دیکھتے ہی دل بے تاب ہے۔ اجی صاحب گلدستۂ اربعہ عناصر کو لائیے اور محفلِ مشتاق کو فرمائیے۔ ان پریوں کو ہمراہ لاؤ، جلوۂ پریاں اپنے سلیمان کو دکھلاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم بمبئی سے چیزیں لائیں ہیں، ان کے ارسال میں اہمال نہیں،۔۔۔۔۔۔ ہم نے گلدستہ، نرگس اور فرح بخش دو کتابیں ہدیتاً ارسال کیں تم نے رسید نہ لکھی کیا نہیں پہنچیں، اور اب بہ سبیل پارسل کتھا خوشبودار بھیجا ہے۔۔۔۔۔ رسید لکھو۔۔۔۔۔۔ اور اب ایک سیلہ سفید بنارسی قیمتی یک صدو شصت و نہ روپیہ چہار آنہ علاوہ منافع بصیغۂ پارسل بھیجا جاتا ہے۔۔۔۔۔ ؎

اے فلک وہ بھی دن پھر آئیں گے

ہم خفا ہوں گے، وہ منائیں گے

..... میاں عابد علی صلاح لو اور جو لکھو سمجھ کے لکھو۔ فقط مراتب شرط ہے، بناوٹ خبط ہے۔

شوکت بنام گھیٹی و کیسر

...... واضح رہے کہ ہم نے مقام بمبئی سے دو تین خط اپنے حال کے روانہ کئے ...... مگر ...... جواب ایک کا بھی نہیں لکھا گیا ..... عنایت الٰہی سے ہم بھی گھر کے راجہ اندر ہیں ..... کوئی مانے نہ مانے ...... ہم تم کو مانتے ہیں۔ گھیٹی کے ناز و انداز کا اور کیسر کی تان اور بان کا مزا ہم جانتے ہیں ..... یہ رنج کیا رنج ہے اور کیا درد ہے اور کیا بے چینی ہے کہ چین کو ایک دم چین نہیں ..... ہر دم اس مضمونِ ابیات کا تصور بنا رہتا ہے ؎

ہو ستمگر گھیٹی و کیسر میرے پہلو میں بر سرِ بستر
لب سے لب منہ سے منہ ملاؤں میاں اور زباں سے زباں لڑاؤں میں
سینے سے سینہ، دل سے دل مل جائے .... چھل چھل جائے
تیرے سر کی کبھی بلائیں لوں! رات بھر تو دم نہ لینے دوں
کبھی دے اپنا تو چبا کر پان کبھی دے اپنے منہ میں اپنی زبان
کبھی لوٹوں مزا میں .... کا بوسہ گالوں چہ زنخداں کا
کبھی آنکھوں پہ تیری بوسہ دوں کبھی گالوں پہ اپنا منہ رکھ دوں
گاہ .... پہ تیری چٹکی لوں کبھی .... مساس کروں
لبِ شیریں کی گر مسی چاٹوں کبھی آہستہ سے میں لب کاٹوں
پر کروں کیا یہاں نہ پاس ہے تو نہ تیرے دل پہ کچھ مراقبا ہو

...... اگر تم کو ہماری یاد ہے تو تمہارا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ کسی طرح کا دریغ نہیں ہے ...... ہم تو عشق کے چاکر ہیں، محبت ہماری رہبر ہے، چاہ ہماری پیشوا ہے، پیت اور پریم ہمارا مربی ہے، جو ہم کو چاہے، اس پر رحمتِ الٰہی کا نزول ہے، اور جو ہم سے باغی ہو، اس کے پھاڑنے کو شیرِ خدا صفدر مستعد اگر دن اس کی ذوالفقار علی سے ملول ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تم پر مرتے ہیں، ہم بازارِ محبت میں بک چکے یہ حال

اپنا حسب حال اس غزل کے رکھتے ہیں ۔ ؎

مار ڈالے ہیں تری زلف نے جاناں کتنے
سر پٹکتے ہیں کئی پھرتے ہیں ناداں کتنے
دونوں کے گیسوئے کافر نے دکھا کر جلوے
بے ایماں کر دیے ہیں، صاحب ایماں کتنے
نہیں لگتا ترے نافے کا پتہ او لیلیٰ!
چھان ڈالے ترے مجنوں نے بیاباں کتنے
جی لگایا ہے لگاوٹ نہیں لگتی جس جا
واہ جی حضرت دل، تم بھی ہو ناداں کتنے!

شوکت بنام عمدہ جان[1]

ہر دے کی تمہاری آن بان اور اسی وقت کی تمہاری آن ہمارے نقش خاطر ہے ۔ ہر دم تم کو یاد کرتے ہیں..... اور اکثر اس بیت کا ورد کرتے ہیں

سانوری کو کر رکھوں تعویذِ جاں ؛ موت یاد آتی ہے اس گوری کو دیکھ

..... لشکرِ سرکار ہماری میں سے جس نے تمہاری آواز سنی یا تم کو دیکھا، محو حیرت ہو گیا ۔ اس سبب سے سب مرتے ہیں اور اس موت کا ذکر کرتے ہیں ۔ میں بھی تمہارے گانے کا مشتاق ہوں، ...... افسوس صد افسوس کہ تم دوسروں سے باغ حسن کا کٹواتے ہو..... تم نے کہا تھا کہ بھوپال سے خط لکھنا، سو ہم نے وعدہ پورا کیا ۔ تم بھی اور کچھ نہ کرو تو خط و کتابت سے تو درگذر نہ کرو..... فقط

---

[1] عنوان میں نام یوں درج ہے "...... عمدہ طوائف سکنہ باندہ وارد ہردہ .... اس سے معلوم ہوا کہ عمدہ جان باندہ کی رہنے والی تھی اور جب شوکت کی نظر چڑھی تو وہ ہردا میں آئی ہوئی تھی ۔

شوکت بنام گیتی آرا بیگم

اۓ مٹک چھنالی[1] ...... گیتی آرا بیگم۔ سلامت .....
یہ زبان قلم اتحاد کا اظہار دل میں ہزار خار ہے
منہ پہ میٹھے، تو دل میں زہر بھرے ؛ ایسے شیریں کلام پر پاپوش

..... زبان بند، فتنہ بر دوش۔۔ بھوپالیوں کے کان کاٹتی ہیں۔ کیا کیا نئی گرا ھت کے فقرے چھانٹتی ہیں۔..... تم کو غیروں کے پاس مفت رہنا، ہم کو رنج سہنا..... تم تو اجی جادو کار، فتنۂ روزگار، سحر ساز، سراپا ناز، خانہ بر انداز ہو، بلا کے دم باز و عشوہ طراز ہو۔

گل پھینکیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی!

..... ہمارا بلانا اور پھر تمہارا نہ آنا، بے جا اترانا، شتر غمزے دکھانا، فریب کی لینا، ہم کو جُل دینا، کیا خوب، طرہ یہ کہ سکھپال منگانا اور حیلہ بہانہ جتانا، ہمارا دل دکھانا پھر تمہاری باتوں میں آنا، حماقت کا تیشہ اپنے پاؤں میں لگانا ہے..... یہ تو فرمائیے بیٹھے بٹھائے، اندوہ جدید مول لینا، حسرت میں ایڑیاں رگڑنا کس مذہب میں روا ہے..... بندہ آپ کی حاجت روائی کو آمادہ ہے..... فقط........

شوکت بنام ...؟

تازہ بہارِ چمنستان دلپذیر ہے

گل و گلزارِ حسن رعنا ہے	بلبلِ شاخسار زیبا ہے
صبحِ شوقِ وصالِ جسمانی	بعد صد ذوقِ وصلِ روحانی
اے پری پیکرِ خجستہ لقا	دلکش و دلربا و شوخ ادا
مونس و غمگسارِ عاشقِ زار	مہرباں و پری رخ و دلدار
جب سے صورت تری نظر آئی	مجھ کو حیرت نے شکل دکھلائی

---

[1] یہ خط بعد کا اضافہ ہے اور خود شوکت کے قلم سے ہے۔

اللہ اللہ ترا وہ حسن و جمال
چال سے اک جہاں ہے پامال

رخِ پرنور مہرِ عالمتاب
رنگِ رخسار سرخ، ہوشِ شباب

زلفِ پرپیچ، دشمنِ ایماں
تیغِ ابرو پہ لاکھ جاں قرباں

طرزِ ناز و ادا خدا کی پناہ
ستمِ بے محل، جفا کی پناہ!

چشمِ بیمار نے کیا بیمار
نگہِ مست نے کیا سرشار

دل کو باندھا کمینۂ گیسو نے
کر دیا قتل تیغِ ابرو نے

دہنِ تنگ نے کیا دل تنگ
رنگِ رخ نے نیا دکھایا رنگ!

میں ہوں تیرے وصال کا طالب
ہو میسّر گمان ہے غالب

خوب عشوؤں نے ہاتھ پائی کی!
لشکرِ ہوش کی صفائی کی

دیکھی جب سے تری کمر کی لچک
بے کلی دل کے ساتھ ہے ابتک

قد و قیامت بلا ہے، آفت ہے
چتونوں میں عجب شرارت ہے

الغرض سر سے تا بپا آفت
غیرتِ حشر جلوۂ قامت

کیجئے آشکارا اس کا نام
عشق نے بھی جسے کیا ہے سلام

اے شمعِ بزم افروز عشاق! جب سے تیری صورت دیکھی ہے تمام بدن میں رعشہ پڑ گیا۔ دل دھڑکنے لگا...... دل نے بے اختیار چاہا کہ ایسی معشوقۂ ہوش ربا کو کلیجے میں رکھ لیجئے...... گفتگو کیجئے۔ لب کی جستجو کیجئے۔ کہو کیا کیا جائے ؎

خوں رگِ مجنوں سے نکلا فصد لیلیٰ نے جو لی
عشق میں تاثیر ہے پر جذبِ کامل چاہیے

اس روز ہم آئے تھے، ایک آدمی ساتھ لائے تھے، تم کو نہ دیکھا جو یاد تھا وہ بھولا، ششدر و حیران رہ گئے[1] ...... سچ کہو تمہارا کیا حال ہے ؎

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

...... ہر وقت جان دینے پر آمادہ ہوں ...... بے قراری سے زار زار روتا ہوں

---

[1] یہ اور ایک دو فقرے اس سے پہلے اور اس کے بعد شوکت نے لکھ کر کاٹ دیئے ہیں۔

جی چاہتا ہے بے موت مر جاؤں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پر دل قبول نہیں کرتا ہے

فرقت میں تھی جان تلف کی نہیں جاتی
اے جانِ جہاں، جان تو یوں دی نہیں جاتی

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدارا ایک دم کو مجھ عاشقِ صادق خستہ جگر پریشان خاطر کے گھر آؤ۔ ۔ ۔ ہے

ایسے جینے سے کاش مر جائیں جان پر یہ ستم ہی کر جائیں
پر کریں کیا کہ ہو گئے مجبور ہے زمیں سخت اور فلک ہے دور
اب تو فرقت بہت ستاتی ہے آمری جاں کہ جان جاتی ہے
دل شکن ہے ترا بیاں شوکت سحرِ فن ہے تری زباں شوکت

نامۂ شوکتِ خجستہ کلام
ختم شد السلام والاکرام

شوکت بنام محبوب جان

گلِ گلزارِ چمنستانِ دلپذیر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسمی محبوب جان زاد اشتیاقہ بعد ما وجب آنکہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دلم بردی و دلداری نہ کردی
غم دادی و غمخواری نہ کردی

بخدا جب میں تم کو یاد کرتا ہوں مثل ابر بہار رو رو کر دُرِ خوش آب سے دامن بھرتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رات بھر چین نہیں ہے ہے

شب کو آرام ہے ، دن کو چین
شغل ہے رات دن کا شیون و شین

۔ ۔ ۔ ۔ جب وہ ترا جوبن یاد آتا ہے، پہروں آئینہ وار ششدر و حیران بنا تا ہے ہے

ہوش و خرد گئے نگہہ سحر فن کے ساتھ
اب جو ہے اپنی بات سو دیوانہ پن کے ساتھ

۔ ۔ ۔ ۔ خدارا ایک ساعت کو آئیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زیادہ سوائے شوق کے کیا لکھوں بمصداق اسکے ع

زیادہ اب کیا لکھوں سرِ دست
ہوتا ہے دوات میں قلم مست

بڈھی کہنچن کا نامہ

بنامِ دخترِ علّامہ[1]

اے رونقِ بزمِ خامکاری
اے موجِ یمِ حرامکاری

اے بلبلِ گلشنِ ندامت
اے گلشنِ روضۂ ملامت

اے فاحشہ، مطربہ، حمیقہ
علّامۂ دھر بد طریقہ

اے شوخ ارے اوچھال چھکّا!
دیدہ ہے ماں کی طرح پکّا

قائم رہے تیرا رنگ و روغن
اے میری بڑی صفت نظامن

نانی کا ہے تجھ سے نام جاری
دادی کی ہے تجھ سے یادگاری

یہ یاد رہے سخن پدر کا
(چھوٹ) جائے نہ کوئی (ابال) سر کا

جاگا ہے ترے سبب مقدر
تو بیٹے کروں (نہ کیوں نچھاور)

کیا نام بزرگوں کا اچھالا
افلاس کو میرے گھر سے ٹالا

قائم رہے دہر میں تو پیاری
روٹی کا ٹھکانا ہے تو پیاری ہماری

ہشیار ذرا سفر میں رہنا
پھسلا کے نہ کوئی لے لے گہنا

بھائی کو ذرا ملائے رکھنا
سینے سے اسے لگائے رکھنا

آرامِ دل و جگر ہے وہ بھی
امیدِ دلِ پدر ہے وہ بھی

حیواں ہے اگرچہ تیرا بھائی
ہے واقفِ طرزِ آشنائی

بھیجا ہے اس لئے ترے پاس
بنجائیگا آدمی وہ نسناس

حاصل ہوئی گر اسے لیاقت
دلالوں کی پھر نہ ہوگی حاجت

ہشیار جو ہوگیا وہ مردک
لائے گا تلاش کر کے گاہک

ابا کے ترے ہے اب بڑھاپا
اپنا ہی تو سوچیو نہ آپا

---

[1] یہ منظوم خط شوکت کا فکر کردہ اور بخط مصنف ہے۔

ہاں یاد رہے پدر کا کہنا	کچھ خرچ روانہ کرتے رہنا
کیا ہوگئی خاصیت رتبہ کی	صد حیف ہوئی نہ تیرے ڈھ کی
لے خصلتِ مادری سے حصّہ	مادر کا نہ بھول اپنی قصّہ
افسوس کہ ڈھل چلی جوانی	آیا نہ چھپڑانا تجھکو پانی
ماں تیری اگر بجھے نہ جنتی	بگڑی ہوئی بات کب یہ بنتی
تو بھی کسی مرد کو پھنسالے	لڑکی کی فقیر سے دعا لے
ہاں ہوش کے داؤں میں نہ آنا	وہ مرد غضب کا ہے سیانا
آگاہ نہیں تو اس کے شر سے	ماں کو تری لے گیا تھا گھر سے
پر ایک ہے بمبئی میں شاعر	اوصاف ہیں اس کے سب پہ ظاہر
ہوتا ہے غریبوں کا وہ حامی	کہتا ہے ہر اک اسے نظامی[1]
بھائی کو تمہارے اس نے پالا	پردیس میں مفلسی کو ٹالا !
محسن بھی ہے علم میں بھی کامل	ہر بات میں دیکھتا ہوں قابل
ہے ٹھیک ترے لیے وہ جوڑا	بھائی کو ترے ملے گا گھوڑا

ان باتوں کو یاد رکھ ہماری
تو خود بھی ہے ہوشیار پیاری

اب ان خطوط سے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو طوائفوں نے شوکت کو لکھے۔ اگرچہ زیادہ تر خطوں پر مکتوب نگار کا نام نہیں تاہم شوکت کے خطوں سے ملا کر پڑھنے کے بعد بہت سی باتیں کھل جاتی ہیں۔ اس طرح یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ طرفین کے خط اصلی ہیں محض انشا پردازی کی مشق نہیں۔

---

[1] میرے کتب خانے میں رسالہ 'تحفۂ بمبئی' کے ۱۹۰۵ء کے کچھ شمارے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نظامی اس وقت بمبئی کے مشہور شاعروں میں تھے۔ ان کا کلام 'تحفہ' میں شامل نہیں، مگر کئی شاعروں کا کلام موجود ہے جنھیں "حکیم نظامی صاحب مدظلہٗ الیسانی کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ خود مدیر 'تحفہ' فائق کے بڑے بھائی محمد باقر علی خاں بارق کے شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ بمبئی کے نور محمد انور، سیف الدین سیف وغیرہ بھی انھیں کے تربیت یافتہ تھے۔ نظامی ۱۲۸۷ھ میں جبلپور میں پیدا ہوئے اور ایک عرصہ بمبئی میں رہنے کے بعد ۱۳۳۲ھ (۱۹۱۴ء) میں جبلپور میں ہی فوت ہوئے۔

طوائفوں کے خطوط بنام شوکت

(۱) سبحان اللہ کیا خوش زمانہ ہوگا کہ عاشق و معشوق ہم پیمانہ ہوں گا ؂

خوشا وقتے و خورم روزگارے
کہ بارے برخوردانو صل یارے

بموجب تحریر حضور کی قصد بھوپال کر کے ایک منزل تک راہ پیما ہوئی۔ قضائے الٰہی سے ایک بیل رتھ راہی ملک عدم ہوا۔ راستہ خراب ہے۔ پیادہ پائی گراں ہے، چوراچکوں کا راہ روکوں کا خوفِ جاں ہے۔ لہٰذا ..... زادِ راہ بہت جلد ارسال فرمائیے۔ فدویہ حاضرِ دولت ہوتی ہے ......

(۲) ...... سلام شوق ..... ؂

خواب میں تم نے اگر شکل دکھائی ہوتی
جو بلا جان پر آئی ہے، نہ آئی ہوتی

.... اللہ تعالیٰ حضور کو ساتھ اس یادآوری کے سلامت رکھے .... عرصہ قریب ایک سال کا ہوا کہ چندر بائی شہر کلکتہ میں گئی .... ناچ گانے میں تیار ہیں۔ اور شکل و شمائل میں بھی یکتائے روزگار ہیں اور مدت مدید سے میرا بھی قصد آپکی طرف آنے کا تھا۔ مگر بموجب تحریر آپکی توقف کیا لیکن نہایت مشتاق تھی۔ جمال جہاں آرا کی جدائی میں گریباں چاک تھی۔ اب جو حضور نے طلب فرمایا۔ نشۂ شباب نے رتبہ دوبالا کیا۔ اب زادِ راہ بہت جلد عنایت فرمائیے .....

(۳) ..... اس سے پہلے چند قطعہ نیاز نامہ بہ سبیل ڈاک انگریزی خدمت والا میں ارسال کئے۔ یقین ہے کہ بشرفِ مطالعہ پہنچے ہونگے اور جو خط کہ رجسٹری کرا کر مرسل خدمت گرامی کیا۔ اس کے پہنچنے میں کچھ کلام نہیں۔ جواب میں جو توقف ہوا خط ہذا رجسٹری کرا کے بھیجا گیا۔ اور میں ہر طرح سے حاضر سو جان سے طلبگار اور تیار ہوں مگر منتظر جواب باصواب ہوں۔ خط رجسٹری بر سبیل ڈاک جلد بھیجیں انتظار خط میں دل مرا مانند مضمون مصرع کے حال رکھتا ہے ؂۔

چوں کوس روزہ دار بر اللہ اکبر است

(۴) ...... عرض یہ ہے قطعات مکرر بھیجئے۔ مگر خدا جانے کیا ہوا۔ جواب نہ آیا، محبت میں فتور ہوا یا قاصد سے قصور۔ یا مجھکو غزلخوان دیوانِ محبت نہ سمجھا...... میں نے ارادہ شہر کلکتہ کا چھوڑا آپ کے انتظار سے منہ نہ موڑا.... جواب خط کا ضرور بھیجیں۔

(۵) ..... محبت نامہ آیا۔ مضمون جدید لایا۔ قبل اس سے... چاہا تھا کہ فقط بنو جان وغیرہ کو چھڑی سواری لے جاکر ملازمت کر کے چلی آؤں گی لیکن یہ خط کہ براہِ بیرنگ آیا۔ اس میں شادی ختنہ کا احوال پایا۔ فدویہ کو تردد ہوا کہ بتقریب ہذا ساتھ لوازم کے جانا چاہئے۔ البتہ قریب پچاس زن و مرد کے میرے ہمراہ ہونگے۔ عنایت الٰہی سے ادنیٰ اعلیٰ اس شہر کے میری تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ کسی کے نوکر ہوں اور کسی رئیس کی سرکار سے مجھے ویسی ہی منفعت ہوتی ہے...... سب سے بے مروتی کر کے تیار ہوئی ہوں..... اب امیدوار ہوں کہ حضور بلاویں اور زادِ راہ معقول الیسام سل فرماویں کہ روسائے شہر کو بھی معلوم ہو...... مبلغ پان سو روپیہ بار برداری میں خرچ ہوگا۔ مبلغاں مرسلِ حضور ضائع نہوں گے۔ تمام بھوپال ہمارا علم و ہنر دیکھکر خوش ہوں گے۔ اور حضور جس سے جی چاہے لڑاویں..... ہار جاؤں تو ایک کوڑی سرکار سے نہ پاؤں.....

جناب مہاراجہ صاحب بہادر (گوالیار) کو بھی معلوم ہوگیا ہے۔ مگر میں آنے خدمتِ عالی سے نہ رکونگی.... بنو جان، نورتن جان گانے ناچنے میں ہنایت تیار ہیں سب طرح کا رقص و سرور جانتی ہیں، خیال، دھرپد، پٹہ، ٹھمری، غزل خوب گاتی ہیں۔ اور شکل و شمایل میں یکتائے روزگار ہیں...... منور جان بھی خوب گاتی ہیں۔ بجاتی ہیں۔ اور چندر بائی عرصہ دو سال سے کلکتہ کو گئی ہیں۔ اس کا حاضر ہونا ممکن نہیں۔ حاضر الوقت مسمیانِ ذیل بنو جان، نورتن جان، نورجہاں، محبوب جان، امر جان، منا جان موجود ہیں...... میرا بھی قصد جانے طرف کلکتہ کے تھا۔ مگر حضور کے بلانے سے موقوف کیا..... تاریخ اور روز اور ماہ سے شادی ختنہ کے آگاہ فرماویں۔ فقط

(۶) ..... ہنڈوی مرسلہ حضور میعادی ۵۱ روز کی عین انتظار میں بتاریخ پنجم ماہ حال سن رواں کو پہنچی وہ ھنڈوی دکان لچھمن داس انوپ سنگھ بنارس

کی تھی۔ لشکر (گوالیار) کی نہ تھی۔ آخرش اس ہنڈی کو یہاں لالہ سمن لال کی کوٹھی میں

فروخت کردی۔ اوراس میں تین روپے کا نقصان ہوا تھا..... ۔ میں نے تیاری

حاضر ہونے کی سب کرلی تھی بسپاہیان ہمراہی وغیرہ کو اپنے پاس سے روپیہ بھی

تقسیم کردیا تھا۔ اور ہرچند کہ میں تعزیہ داری..... کرتی ہوں سب...... میرے

مکان پر تشریف لاکر مرثیہ خوانی کرتے ہیں۔ مگر..... ارادہ بھوپال مقدم کیا تھا

اور بعد محرم بڈھا منگل یہاں ہوتا ہے۔ بہت تیاری سے کہ سرکار عالی جاہ کثرت سے

اس میں روپیہ صرف کرتے ہیں۔ سو سب سے منہ پھیر کر حضور کی طرف ہزار دل سے

متوجہ ہوئی تھی۔ مگر...... مہاراجہ بہادر نے رخصت نہ دی اگر آپ کے ہاں شادی ہو

گئی ہو تو خیر۔ اگر بعد عشرہ محرم ہووے تو اطلاع دیجئے..... فقط

(۷) .... دو خط فرحت آثار مسرت انجام آئے مگر..... دونوں

سے سوائے صورت نفاق کے کچھ نہ نکلا..... ہرچند جس نے تدبیر صفائی کی کی..... مگر

ہنوز روز اول ہے، طبیعت حیران اور پریشان ہے ؎

توئی مطلوب گر نزدیکِ غیرم

توئی معبود گر مشغولِ دیرم

..... معذرت شکایت نامہ شراب نوشی و بدمستی و بے ہوشی نائکہ مانوجی کے

کہ شراب پی کر فرش پر لوٹ دیا تھا، تحریر ہوا۔

(۸) ..... ؎

ہمیشہ کنج تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں

الم کو، یاس کو، حسرت کو، بیتابی کو، حرماں کو

.... شکایت نامہ نسبت اطوار والدہ ماجدہ کے..... درست و بجا ہے۔ فدویہ قصور

وار سرتاپا ہے۔ لیکن حقوق مادری دست بداماں بلکہ پنجہ بگریباں ہیں..... اس مقدمہ

میں کچھ بھی ان سے بول نہیں سکتی..... والدہ ماجدہ بے سبب پیری کے..... مورد

حرکاتِ ناموزوں کی ہوئی ہے..... اس صورت میں حضور سے امیدِ عفو و خطا ہے

..... میری والدہ (نے)..... سرکار جنت آرام گاہ کی خدمت میں عمر کارہ کو یعنی

جوانی کو نثارِ خدمت کیا۔ اس ناکارہ عمر میں..... آستانۂ عفو درگذر سے دور کرنا

مناسب نہیں .... حضور کو خود معلوم ہے جناب نواب صاحب جنت آرام گاہ وجناب نواب سکندر بیگم صاحبہ اِرم خرام گاہ کیا کیا قدردانی اور کس کس طرح نازبرداری والدہ ماجدہ کی..... فرماتے تھے..... یوں آپکی خوشی ہے مجھے قتل کیجئے۔ بر حق تو یہی ہے کہ میری کچھ خطا نہیں.... طلب فرمانا یا فراموش کرنا اختیارِ حضور ہے۔ ہم کو تو بجز فرمانبرداری دوسری بات منظور نہیں ....

یاد کرنا ہر گھڑی دلدار کا

ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

..... حضور تحریر فرماتے ہیں کہ تمہاری ماں تم کو لے کر غیروں کی طرف چلی گئی.... (اوّل تو (آپ) ہم کو نہ جانے دیتے۔ اگر جانے کا حکم دیا تھا تو سواری پینس کی دیتے۔ آپ نے بہلی سواری کو دی .... خیر گذرا جو گذرا۔

(۹) ..... بہ سبب امر معلوم کے حاضری سے فدویہ معذور ہے.... اور سگِ مرسلہ حضور شاید وہاں کسی سے ..... کر کے آیا ہے۔ لہٰذا وہ رہتا اس جگہ کا مجبور سمجھ کے رنجور رہتا ہے۔ اگر حکم ہو تو اس خود بیں کو کان کٹانے کے واسطے حضور میں بھیجا جاوے۔ اور یہاں اس کے کان کٹیں امکان میں نہیں......

(۱۰) اگر حضور کو اس مہجور پر نظر ترحم باقی ہے تو بہ ترسیل سواری طلب فرمائیے ..... جس نے سرکار کے نمک سے سروکار رکھا پھر کچھ کہیں مزہ نہ چکھا.... جو مضامین رنگین اور الفاظ نمکین نامہ جات عالی میں قلمِ جادو نگار سے زیبِ صفحۂ کاغذ ہوتے ہیں۔ اگر بجواب اس کے تمام جمہور نزدیک و دور ہم زبان و ہم قلم ہوں، سب کے زبان بیان ولسان قلم .... ہوں، ایک فقرہ کا بھی جواب کہ لاجواب کہتے ہیں کبھی نہ سیکھ سکیں ..... حضور میری لیاقت سے بخوبی واقف ہیں پھر کس واسطے حضور ایسی تحریر فرماتے ہیں کہ سوائے دیکھنے کتاب لغات کے ..... سمجھنا محال ہوتا ہے .....

گھسیٹی وکیسر

بنام شوکت!

..... والدہ کے مرجانے سے ہوش وحواس میں اختلال ہے۔ مگر آپ کے ملنے کا مجھکو ہر دم خیال ہے اپنے پرائے ماتم کو آتے ہیں۔ ماتم پرسی کے رسم مناتے

ہیں۔ رسم رسوم سب باقی ہیں۔ لونڈی اسی میں بہت شاکی ہے۔ اگر تاتمام چھوڑ کر چلی آتی ہوں، تو موجب رسوائی ہے۔ اگر آنے میں توقف کرتی ہوں تو..... موجب نارسائی ہے۔ نہ منہ جانے کا نہ ٹھکانا رہنے کا۔ آگے آگ پیچھے دیوار.... خاطر جمع فرماویں۔

مُنّا جان

بنام شوکت

..... خدا جانے حضور نے لونڈی میں کیا قصور پایا کہ نظروں سے گرایا..... آپ کے بہت پری اور پرستار ہیں..... میں بھی وابستۂ فتراکِ سرکار ہوں..... پھر کیا سبب کہ مرکز مزاج سے دور تر مانند پرکار اور دائرۂ ہر کار ہوں..... حضور کے بلانے کے انتظار میں ہوں۔

نہ قاصدے نہ صبائے نہ مرغِ نامہ برے
کسے کہ بیکسیِ ماتمے برد خبرے

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

سیّد جمیل الدین بغدادی مرحوم

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

نہیں معلوم مولانا سید عزیز الدین قادری بغدادی مرحوم کی ولادت کب ہوئی اور وہ ہندوستان کب تشریف لائے مگر انہیں کی بتائی ہوئی باتوں سے جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ اوّل اوّل وہ کراچی بندرگاہ پر اترے کوئی پچیس برس کا سن تھا اور وہاں کے ایک عرب باشندے کے مشورے سے جو عرصہ سے وہاں رہ رہا تھا بحری راستہ سے بمبئی تشریف لائے۔ کراچی سے بمبئی تک کے سفر کا کرایہ دو روپے ادا کیا تھا۔ بمبئی میں کچھ عرصہ رہے اور جلد ہی اپنی عالی نسبی علمیت، طریقت، اور صفائی قلب کی بدولت مشہور ہو گئے اور کئی خاندانوں نے ان سے بیعت کر لی پیری مریدی کا سلسلہ زور شور سے چل نکلا اور جہاں جہاں وہ گئے ان کے مرید بڑھتے گئے۔ میں نے کسی مرید کا ایک خط ملیشیا سے آیا ہوا ملاحظہ کیا ہے۔ جس کے کوائف سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے انڈونیشیا، ملایا، سنگاپور وغیرہ کا سفر بھی کیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سے زیادہ بار سفر کیا ہو۔ ہندوستان میں بھی کہاں کہاں نہ گھومے پھرے، کچھ دنوں ٹھہرے اور آگے بڑھ گئے حتیٰ کہ ٹونک پہنچ گئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ مگر چھوٹے بڑے سفر اسکے بعد بھی جاری رہے۔

سید عزیز الدین کی عمر کے متعلق بہت سی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ ایک سو دس ۱۱۰ برس سے لے کر ایک سو بیس ۱۲۰ برس تک کی عمر بتائی جاتی ہے۔ خود ان سے پوچھا جاتا تو فرماتے "معلوم نہیں۔ ٹونک میں پہنچا تو نواب محمد ابراہیم علی خاں کا عہد تھا۔ اب چمڑی کہاں رہ گئی ہے بس ربڑ بن گیا ہوں"۔ امین الدولہ وزیر الملک حافظ محمد ابراہیم علی خاں بہادر صولت جنگ انیس سال کی عمر میں ۲۳ شعبان ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) کو والیٔ ریاست ٹونک مقرر ہوئے سید عزیز الدین پھرتے پھراتے غالباً ۱۸۹۰ء کے قریب یا اس کے بعد ٹونک پہنچے ہوں گے۔ مگر یہ سب قیاس ہے۔ صرف ایک ہی ماخذ ایسا ہے جس کی رو سے ان کی عمر پر کچھ روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ کوئی پون صدی پہلے سید صاحب کے مریدوں نے ان کی مدح میں اشعار لکھکر چونتیس ۳۴ صفحے کا ایک رسالہ شائع کیا تھا جس کا نام "دیوان المریدین فی مدح حضرت مولانا و مرشدنا السید عزیز الدین القادری البغدادی الاعظمی .... رکھا تھا۔"

یہ رسالہ "باہتمام و تصحیح کفش برادرِ خاص عبدالواحد خاں عرف بناخاں رامپوری محلہ راج دوارہ" شائع ہوا اور مطبع سعیدی رامپور سے چھپا۔[1] اس کے صفحہ بتیس پر محمد حسن خاں اکبر مرادآبادی کی ایک نظم بعنوان "تاریخ رخصت جناب سید عزیزالدین صاحب بغدادی" کے کچھ اشعار یہ ہیں ؎

رقم اک نوجوان مہ لقا کی کرتا ہوں مدحت ۔۔۔ عیاں جس کے جمالِ رخ سے ہے اللہ کی قدرت
حدیث و فقہ داں اللہ اکبر عالم اکبر ۔۔۔ مفسّر اکبر قرآن اعظم، صاحبِ قراءت
تصوف کی طریقت کی، شریعت کی حقیقت کی ۔۔۔ علوم علم اللہ کی کھلی ہے اس پہ ماہیت
سترھویں کو جمادِ اولیٰ کے دن ادینہ کی ۔۔۔ مرادآباد میں آمد سے اسکی ہوگئی برکت
ہوئی اس دھوم سے دیں کی محبت دن بدن افزوں ۔۔۔ بہت سے معتقد اور سینکڑوں نے اس سے کی بیعت
ہزاروں آدمی حلقہ میں شرکت آ کے کرتے ہیں ۔۔۔ وہ ہوتی ذکرِ حق سے ہے شب حلقہ میں کیفیت
ندائے غیب سن کر اکبر نے تاریخ رخصت کی ۔۔۔ لکھی دل تھام کر مدح سے فرقت کے یہ باحسرت

مرادآباد سے سید عزیزالدین بغدادی
نویں ماہِ رجب کو دن جمعہ کے "پا گئے رخصت"
۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء)

گویا انتقال (بمبئی ۱۹۶۹ء) سے چونسٹھ برس پہلے سید صاحب مرادآباد میں تھے یہاں انہوں نے ۱۷ جمادی الاول ۱۳۲۳ھ سے ۹ رجب ۱۳۲۳ھ تک تقریباً پونے دو مہینے قیام کیا۔ مطلع میں "نوجوان مہ لقا" محض زیب داستان کے لئے آیا ہے۔ ورنہ جن سے اتنی قلیل مدت میں سینکڑوں نے بیعت کر لی ہو، جن کے "بہت سے معتقد" بن گئے ہوں، جو "حدیث و فقہ داں" اور "مفسّر اکبر قرآں" مانے گئے ہوں وہ شخص لغوی معنی میں "نوجوان" نہیں ہو سکتا۔ یہاں بھی قیاس یہی چاہتا ہے کہ اس وقت سید صاحب تقریباً چالیس سال کے خوبرو انسان

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ دیوان صرف مریدوں ہی میں تقسیم کیا گیا تھا اور اس کے لئے خاص قیمت بطورِ ہدیہ مقرر کی گئی تھی۔ چنانچہ اس دیوان کے آخر میں قلم سے یہ عبارت درج ہے۔

"حسن علی خاں سے دیوانِ ہذا ہدیہ سوا گیارہ روپیہ
دے کر حاصل کیا۔ فدا علی خاں رسالدار"

(باقی اگلے صفحہ کا حاشیہ دیکھئے)

ضرور رہے ہونگے۔ اس طرح میرے خیال میں کچھ کمی بیشی کے ساتھ سید عزیزالدین نے ایک سو چار ۱۰۴ برس کی لمبی عمر پائی۔ گویا وہ بغداد میں تقریباً ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲ جنوری ۱۹۶۹ء کو بمبئی میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔

تاریخ درج نہیں ہے غالباً اسی زمانے یعنی ۱۹۰۵ء میں مریدوں کے "حسب التماس" سید صاحب نے ایک رسالہ "شجرہ عزیزیہ قادریہ المعروف بہ عزالسالکین" شائع کیا تھا جس میں دفعِ مصائب کے لئے وظائف وغیرہ کا اندراج ہے۔ اس میں سیّد صاحب کا منظوم شجرہ بھی شامل ہے جس سے انکی عالی نسبی کی تصدیق ہوتی ہے۔ چند اقتباسات ذیل میں دیئے جاتے ہیں ؎

قادریہ شجرہ سلکِ نظم کر منسلک تا وظیفہ ہو مرید باصفا کے واسطے

اے خدائے قادرِ معطی کریم بے نیاز ہاتھ اپنے اب اٹھاتا ہوں دعا کے واسطے

مرشدی سید عزیزالدین غوثی ہاشمی کر عزیز اے رب مجھے اس رہنما کے واسطے

دے شرف پرہیزگاری میں مجھے اے کردگار متقی سید شریف خوش لقا کے واسطے

شیخ سید ذی کرم حاجی محمد مغربی کر ہدایت حج کی اس پیرِ کلاں کے واسطے

اس کے بعد بتدریج حبیب اللہ، عبد غفار، سید شیخ یوسف، سید اسمٰعیل، سیّد صالح سید یحییٰ، بدرالدین، سید موسیٰ، فضل اللہ محمد، سید ابراہیم، عبد رزاق، عبد جبار، عبدالعزیز شمس الدین، عبد وہاب، یحییٰ کا ذکر ہے۔ پھر سید عبدالقادر جیلانی کا ذکر ان الفاظ میں آتا ہے ؎

(بقیہ ص ۶۶ کا حاشیہ)

۳؎ اس صفحہ پر ایک رباعی (قطعہ کہنا چاہئیے) درج ہے جس سے مغالطہ ہوتا ہے کہ شاید سید عزیزالدین بغداد سے سیدھے بدایوں ہی تشریف لائے۔ یہ درست نہیں وہ بغداد سے آئے بھی اور بدایوں بھی تشریف لے گئے مگر بہت سا گھوم پھر کر اشعار یہ ہیں ؎

قاری سید عزیز الدین صاحب
حاجی سید شریف کے ہیں لال!
آئے بغداد سے بدایوں میں
فضل حق اس سے یوں ہے شامل حال

۴؎ معلوم ہوتا ہے یہاں "گئے" کے ۳۰ عدد شمار کئے گئے ہیں۔

شیخ سید عبد قادر شاہ جیلان غوثِ پاک کھول میری آنکھ ان کی خاکِ پا کے واسطے

بعد ازاں سلسلہ درجہ بدرجہ ان ناموں کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ شیخ محرزوقی ، ابو الحسن ، ابو الفرح ، عبد واحد ، ابو بکر شبلی ، شیخ جنید ، سری سقطی ، معروف کرخی داود طائی ، عجمی حبیب ، خواجہ حسن بصری ، حضرت علی ، موسیٰ رضا ، امام موسیٰ کاظم ، امام جعفر صادق ، حضرت محمد باقر ، حضرت زین العابدین + ان کے بعد تین شعر جن میں حضرت امام حسین رضؓ ، حضرت علی مرتضیٰ رضؓ اور رسولِ کریم ؐ کا ذکر خیر آتا ہے قاری کی دلچسپی کے لئے درج کئے جاتے ہیں ؎

نورِ چشم مصطفیٰ یعنی حسینؑ" با صفا دے شہادت اس شہید کربلا کے واسطے

نفس کافر کیش کے حملوں سے مجکو بچا اس شجاعِ دین علیِ مرتضیٰ کے واسطے

احمدؐ و حامدؐ محمدؐ سرورِ کل آفریں افتخارِ اولیا و انبیا کے واسطے

میرے دوست سید جمیل الدین بغدادی جنہیں سب جمیل صاحب کے خوبصورت نام سے پکارا کرتے تھے انہیں سید عزیز الدین کے صاحبزادے اور ان نامور بزرگوں کی ایک شاخ کے نام لیوا تھے۔

جمیل صاحب سات بھائی بہن تھے ، ان کے تینوں بھائیوں سید سعید الدین (حافظِ قرآن تھے) سید امین الدین اور سید حمید الدین نے بتدریج ۱۹۴۰ ، ۱۹۴۳ ، اور ۱۹۵۱ ، میں وفات پائی ۔ تین بہنوں میں سے مریم بیگم نے ۱۹۴۳ء میں انتقال کیا ۔ مسعودہ بیگم ٹونک میں ہیں ۔ اور صدیقہ بیگم بمبئی میں سکونت پذیر ہیں ۔ سید عزیز الدین صاحب کے بیٹوں میں صرف جمیل صاحب ہی باقی تھے کہ ۲۶ اپریل ۱۹۷۵ء کو انہیں بھی بلاوا آگیا اور وہ بھی پروردگارِ حقیقی سے جا ملے ۔

جمیل صاحب نے ابتدائی تعلیم ٹونک ہی میں حاصل کی پھر علی گڈھ چلے گئے وہاں سے شاید انٹر ہی سے اٹھ گئے اور مزید تعلیم حاصل نہ کی ۔ تاہم اُن کی اردو فارسی کی لیاقت بہت اچھی تھی ۔ عربی تو گویا ان کے گھر کی لونڈی تھی

اگرچہ سید عزیز الدین ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ مستقل طور پر بمبئی میں آباد ہو گئے تھے تاہم جمیل صاحب کی شادی ٹونک ہی میں ہوئی ۔ یہ بات ۱۴ جون ۱۹۴۳ء کی ہے ۔ اس کے فوراً بعد جمیل صاحب مع دلہن طاہرہ بیگم کے بمبئی آگئے ۔ سہرا مشہور شاعر اختر شیرانی

نے کہا تھا۔ اِس اعتبار سے کہ سہرا اختر شیرانی کے ایسے شاعر کے قلم سے نکلا ہے اور غیر مطبوعہ ہے اسے قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش کیا جاتا ہے ؎

لگائے چاند کی کشتی میں آسمان سہرا
کہ آج گائیں گی حورانِ کہکشاں سہرا

دکھا رہا ہے بہاروں کا کیا سماں سہرا
رُخِ جمیلؔ ہے پروین تو پرنیاں سہرا

جمیلؔ کو ہو مبارک جوانیوں کی بہار
جواں ہے فصل، جواں عمر اور جواں سہرا

فضا میں پھیلی ہے کیوں طاہرہ کی نکہت آج
ہے کس چمن کی بہاروں کا کارواں سہرا

بہار میں نہ رہا تفرقہ کسی شئے کا
رُخِ جمیلؔ اگر گل ہے گلستاں، سہرا

ہر اک کلی میں دھڑکتا ہے دل بزرگوں کا
کہ ہے بزرگوں کی امید کا نشاں سہرا

کدھر ہے مدعیانِ کمالِ غالبؔ و ذوقؔ
سنیں کہ کہتا ہے اخترؔ سا نکتہ داں سہرا

کچھ خاندانی عزّ و افتخار اور خوش حالی کے سبب سے اور کچھ طبیعت کے لاأبالی پن کی وجہ سے جمیلؔ صاحب نے تمام عمر کہیں جم کر کام نہ کیا۔ کبھی جنگ عظیم کے زمانے میں کچھ دن سنسر بورڈ میں ملازم ہیں تو کبھی چند روز کے لئے کتابوں کی دوکان رکھنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہیں۔ البتّہ گذشتہ سات آٹھ برس سے وہ برابر ایک مشہور مقامی پریس میں پروف ریڈر کا کام سرانجام دے رہے تھے اور غالباً ان کی زندگی میں ایک جگہ کام کرنے کی یہی سب سے لمبی مدت تھی۔

جمیلؔ صاحب کو کتابیں جمع کرنے اور ان کے مطالعے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ اگر کپڑے پھٹ گئے ہیں اور نئے کپڑے سلوانے کے لئے بازار گئے ہیں تو وہ کپڑوں کی جگہ ان پیسوں سے کتابیں خرید لاتے۔ ان کی جیب خرچ کا پچانوے فی صد کتابوں ہی کی نذر ہوتا۔ اور یہ شوق انہیں چودہ پندرہ برس کی عمر سے تھا۔ چنانچہ چالیس پینتالیس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے ان کا مکان نایاب اور کمیاب کتابوں، مخطوطوں، اور دیگر نایاب و نادر دستاویزات کا عجائب گھر بن گیا تھا۔

جمیلؔ صاحب ایک نیک، راست باز، پاکباز، اور خدا دوست انسان تھے۔ وہ چاہتے تو پیری مریدی ہی کے ذریعہ اپنی زندگی آرام سے گذار سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں

کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں اِس کا اہل نہیں اِس کام کے لئے جس باطنی صفائی اور روشن قلبی کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھ میں نہیں۔

جمیلؔ صاحب کی کتابوں سے واقفیت وسیع تھی۔ اور ان کا مطالعہ خصوصاً غالبیات سے متعلق اِتنا گہرا تھا کہ انہیں آسانی سے ماہرینِ غالبیات کی صف میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ کوئی اور واقف ہو کہ نہ ہو، مگر جمیلؔ صاحب کے اِس پہلو سے قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشیؔ اور مالک رام ایسے بزرگ نا آشنا نہ تھے۔ متعدد قرائن سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ جمیلؔ صاحب بہت کچھ کر گزرنے کا ارادہ باندھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے تمام مطالعے سے اخذ کردہ نتائج کو ضبطِ تحریر میں لانا چاہتے تھے، مگر اُن کی بے پروائی کی عادت اور عرصے سے گرتی ہوئی صحت نے انہیں کچھ نہ کرنے دیا۔ تاہم بیس سال پہلے "نوائے ادب"، بمبئی میں غالبؔ کی تصنیف "دستنبو" سے متعلق انہوں نے مضامین کا جو سلسلہ جاری کیا تھا وہ ان کی بقا کے لئے کافی ہے۔ انہوں نے ثابت کیا تھا کہ غالب کا یہ دعوےٰ (جسے تمام ماہرین غالبیات اس وقت تک برحق سمجھتے تھے) کہ "دستنبو" میں اس نے خالص فارسی کا استعمال کیا ہے اور اس میں ایک لفظ بھی عربی کا نہیں آنے دیا سراسر غلط ہے۔ نتیجے کے طور پر ہند و پاک کے غالب پر کام کرنے والوں کو اپنے اندازِ فکر میں تبدیلی لانی پڑی۔

جمیلؔ صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۰ء کے آخر میں ہوئی۔ ایک روز میرے ایک محترم دوست ڈاکٹر صفدر آہؔ کے ساتھ ایک سادہ تو وارد شخص کھلے سر، سفید قمیص اور پاجامے میں ملبوس، چہرہ ذرا سا ٹیڑھا (بچپن میں لقوہ ہو گیا تھا)، پاؤں میں سلیپر پہنے ہوئے، کتابوں کا بنڈل بغل میں، میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ آہؔ صاحب نے تعارف کرایا۔ "یہ جمیلؔ صاحب ہیں۔ غالبؔ کے پرستار اور غالبیات پر ایک زبردست کلکشن کے مالک۔ اس روز سے یکم اپریل ۱۹۷۵ء تک سوا ان چند ایام کے کہ میں بمبئی سے باہر گیا ہوں یا جمیلؔ صاحب بمبئی میں نہ ہوں شاید ہی کوئی دن ایسا رہا ہو گا جب کہ ہم دونوں کے مابین اگر میرے غریب خانے یا آفس پر نہیں تو ٹیلی فون پر باتیں نہ ہوئی ہوں۔ بات زیادہ تر غالبیات اور کتابوں تک محدود رہتی کبھی کبھی خانگی معاملات بھی زیرِ بحث لائے جاتے۔ ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا کہ باتوں میں کسی قسم کی کثافت یا گندگی پائی گئی ہو۔ میں بڑے بڑے ماہر غالبیات کے نیاز حاصل کر چکا ہوں مگر غالبیات سے جمیلؔ صاحب کی شیفتگی اپنی مثال آپ تھی۔

اگرچہ انہوں نے اپنی صحت سے متعلق کبھی کسی اندیشے کا اظہار نہیں کیا تھا تاہم ان کی چال ڈھال سے ظاہر تھا کہ وہ اب ٹھیک نہیں رہتے۔ چنانچہ انہوں نے انتقال سے دس بارہ برس پہلے ہی اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز کتابیں تھوڑی تھوڑی کر کے فروخت کرنا شروع کر دی تھیں۔ ان کا غالب کلکشن بہت اچھا تھا۔ اسے بھی انہوں نے ۱۹۷۱ء کے آخر میں الگ کر دیا[1]۔ اور حج کی سعادت حاصل کی۔

اللہ تعالیٰ نے جمیل صاحب کو جسمانی اولاد سے محروم رکھا۔ پھر بھی ان کی اور ان کی شریک حیات طاہرہ بیگم میں (جو سچ مچ اپنے قول و کردار کی بدولت طاہرہ ہیں) اتنی محبت تھی کہ دوسری شادی کا خیال بھی کبھی جمیل صاحب کو نہیں آیا۔ اگر کوئی کبھی نکاحِ ثانی کی بات کر بیٹھتا تو ہمیشہ ایک ہی جواب دیتے "طاہرہ میری بیوی ہی نہیں میری نام لیوا بھی ہے۔ خدا اسے ہمیشہ خوش رکھے"۔

جمیل صاحب ڈاڑھی تو نہیں رکھتے تھے تاہم خارجی سنجیدگی اور شاید خاندانی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے بالکل مولوی معلوم ہوتے تھے۔ مگر حقیقت میں ایسا نہ تھا جب کھلتے تو خوب کھلتے۔ اس وقت ان کی بات کرنے کا ڈھنگ بھی عجیب شگفتہ ہو جاتا تھا۔ میرے آفس میں وہ بہت ہر دلعزیز ہو گئے تھے۔ جتنی دیر میں اپنے کمرے میں کسی اور ملاقاتی سے مصروف رہتا وہ باہر میرے اسٹاف اور دیگر ملاقاتیوں کو اتنا ہنساتے کہ دفتر کا بیرونی حصہ قہقہہ زار بن جاتا۔

یکم اپریل ۱۹۷۵ء کو وہ آخری بار میرے ہاں تشریف لائے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ نشست رہی۔ کچھ ضروری معاملات پر گفتگو کرنی تھی۔ اپنے سفر کے پروگرام سے مجھے مطلع کرنا تھا۔ معلوم ہوا کہ دفتر سے پندرہ روز کی چھٹی لی ہے اور سولہ یا سترہ اپریل کو ٹونک سے واپسی ضروری ہے۔

۲ اپریل کی صبح اسٹیشن پر جانے سے پہلے ان کا آخری ٹیلیفون آیا۔ چند منٹ بات ہوئی میں نے آخر میں "بسلامت روی و باز آئی"، کہکر دعا دی اور ریسیور رکھ دیا مگر میری دعا ادھوری قبول ہوئی۔ جمیل صاحب ٹونک تو صحیح سلامت پہنچے مگر واپس نہ آئے۔

---

[1] میرے غالب کلکشن کا تقریباً ۲۵ فی صد حصہ جمیل صاحب ہی سے حاصل کیا ہوا ہے۔

پہنچتے ہی بیمار پڑ گئے۔ اور ہزار علاج کے باوجود ۲۶ اپریل ۱۹۷۵ کو جس خاک سے اٹھے تھے اسی خاک میں مل گئے۔ اب وہ ٹونک میں عیدگاہ کے قریب محلہ پایگاہ میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ قبر پر یہ لکھا ہوا ذیل کا قطعہ تاریخ درج ہے ؎

ہوا جب عازم فردوس فرزندِ عزیز الدین
یکایک طاہرہ کی ہوگئی تقدیر فریادی
برائے سالِ رحلت دل حکیما نہ پکار اٹھا
رضا لکھ۔ سیّد اکامل جمیل آلدین بغدادی
۹۵ ۱۳ھ

(مطابق ۱۹۷۵ء)

مالک رام ۱۲ اگست ۱۹۷۵ء کو مجھے لکھتے ہیں۔

"آج آپکا ۱۰ اگست کا خط یہ افسوسناک خبر لایا کہ جمیل صاحب خدا کو پیارے ہوگئے۔ بتا نہیں سکتا کہ کتنا افسوس ہوا۔ خدا انہیں اپنی خاص رحمتوں کا مورد بنائے۔ آمین۔ ایک مخلص دوست ہم سے جدا ہوگیا۔ میں انہیں ۱۹۵۲ء (یعنی ۲۳ برس) سے جانتا تھا.... اس سارے عرصے میں کبھی ان کی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس پر اعتراض ہو سکے...."

جمیل صاحب انتقال کر گئے۔ لیکن اگر زندگی سے مراد شرافتِ نفسی، اصول کی پابندی اور صدق دلی ہے تو وہ یقیناً زندہ ہیں ؎

حیات لاکھ ہو فانی مگر یہ سُن رکھیے
حیات سے جو ہے مقصود غیر فانی ہے

بیاضِ جمیل

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

سید جمیل الدین بغدادی (متوفی ۲۶ اپریل ۱۹۷۵ء) نے غالب سے والہانہ لگاؤ کے نتیجے میں ایک بیاض کی طرح ڈالی تھی، جب کہیں ان کی ملاقات کسی ایسے شخص سے ہوتی، جسے ادب سے عام طور پر، یا غالبیات سے بطورِ خاص شغف ہوتا تو وہ ان سے بیاض میں غالب سے متعلق کچھ لکھنے کے لئے درخواست کرتے، اور دستخط کروا کر تاریخ ڈلوا لیتے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی اہلیہ طاہرہ بیگم نے یہ بیاض مجھے بھجوادی اور کہا کہ مرحوم کی یہی خواہش تھی۔ پھر میں نے اسے آگے بڑھایا۔ ابتک صرف ۱۲۳ اشخاص اس میں شامل کئے جاسکے ہیں۔ فی الحال بیاض ۱۵ صفر ۱۳۶۴ھ (مطابق ۳۰ جنوری ۱۹۴۵ء) سے شروع ہوکر ۱۶ اپریل ۱۹۸۰ء کو ختم ہوتی ہے۔ میرے کتب خانے میں اس بیاض کا نمبر 3140 ہے۔ چونکہ بیاض کی طرح جمیل صاحب مرحوم نے ڈالی تھی اس لئے میں نے اس کا نام "بیاضِ جمیل" مقرر کیا ہے۔ رسماً بیاض کی بسم اللہ انہوں نے ایک مذہبی عالم کے ہاتھوں کرائی تھی۔

۱۔ مولانا محمد طیب ؒ

(ناظم دارالعلوم دیوبند)

گر گزندت رسد زخلق مرنج
کہ نہ راحت رسد زخلق نہ رنج
از خدا داں خلافِ دشمن و دوست
کہ دلِ ہر دو در تصرف اوست

(۱۵ صفر ۱۳۶۴ھ)

۲۔ منشی مہیش پرشاد

"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے"

(۲۷ر دسمبر ۱۹۴۹ء)

۳۔ آل احمد سُرور

غالب کا مطالعہ ایک ادبی کام ہی نہیں، تہذیبی فریضہ بھی ہے۔
غالب پہلا شاعر ہے جو زندگی کے متعلق ہمیں کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے جس کے کلام میں انسانیت کی عظمت، اس کی خلش، زندگی کے رنج و راحت کو ہموار کرنے کا جذبہ اور ایک لطیف شوخی ملتی ہے۔
غالب کا فکر و فن اردو ادب کا ایک غیر فانی سرمایہ ہے۔ انگریز اگر شیکسپیئر کو نہیں بھلا سکتے تو غالب اور ان کے بعد اقبال کے بغیر ہمارا ادب اپنی حرارت اور توانائی سے محروم رہ جاتا ہے۔
غالب سے دلچسپی، ذوق کی پہچان ہے۔

(۲۸ر دسمبر ۱۹۴۹ء)

۴۔ آرزو لکھنوی

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہیں جو معتقد میر نہیں

(۱۴ر فروری ۱۹۵۰ء)

۵۔ مالک رام

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

(۸ر فروری ۱۹۵۲ء)

۶۔ علّامہ کیفی

مرزا نوشہ جدت طرازی کے ساتھ ترقی کے
بادشاہ تھے۔

(۲۷ مارچ ۱۹۵۴ء)

۷۔ محی الدین قادری زورؔ

غالبؔ نام آورم نام و نشانم مپرس

(۱۱ دسمبر ۱۹۵۴ء)

۸۔ رشید احمد صدیقی

گلوں کی جلوہ گری، مہر و ماہ کی بوالعجبی
تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی

(از اصغر گونڈوی)

(۲۵ مارچ ۱۹۶۳ء)

۹۔ مختار الدین احمد

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۲۷ اپریل ۱۹۶۳ء)

۱۰۔ کالی داس گپتا رضاؔ

اشعار نو کا روح و قالب غالبؔ
ہر طور نئی بات کا طالب غالبؔ
شاعر تھا ضرور وہ نرالا ، ورنہ
یوں ہوتی نہ شہر شہر، غالبؔ غالبؔ

(۲۵ اگست ۱۹۷۲ء)

۱۱۔ سید جمیل الدین بغدادی

[جب جمیل صاحب بیاض پر مجھ سے لکھوا چکے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ خود بھی اس بیاض میں شامل ہوں۔ غالبیات کا آپ سے زیادہ رسیا کون ہے،" تو انھوں نے ذیل کے چند الفاظ لکھ کر دستخط کر دیئے]

آج غالب سب پر غالب ہے۔

(۲۵؍ اگست ۱۹۷۲ء)

۱۲۔ ڈاکٹر گیان چند

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔

(۱۷؍ اکتوبر ۱۹۷۷ء)

۱۳۔ قاضی عبدالودودؒ

غالب کے سینکڑوں اشعار مجھے پسند نہیں، ان میں سے چند اس جگہ درج ہیں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اسکی دیکھا چاہیئے

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا!
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی!
یہ جو اک لذّت ہماری سعئی لاحاصل میں ہے

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

(۲۱؍ مارچ ۱۹۷۹ء)

ے بیاض میں قاضی صاحب کی اس تحریر کے مقابل میرا ایک نوٹ ہے جو میں نے قاضی صاحب کے مکان سے فوراً اپنے ہوٹل واپس آکر لکھ لیا تھا۔ یہاں من وعن درج کیا جاتا ہے:۔

"میں نے قاضی صاحب سے (ان کے ناپسندیدہ اشعار پڑھ کر) کہا کہ
ان اشعار میں کئی ایسے ہیں جو اہلِ ذوق کو عام طور پر پسند ہیں۔
آپ نے جواب دیا کہ اس بات کا کیا کیا جائے کہ غالبؔ کے جو بہت
سے اشعار مجھے پسند ہیں، وہ اہلِ ذوق کو پسند نہیں۔"

یہ بات قاضی صاحب کے دولت کدے پر ایک دعوت کے دوران ہوئی جو انہوں نے میرے
اعزاز میں دی تھی۔ کلیم الدین احمد بھی موجود تھے۔]

۱۴۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدارؔ

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے ابھی یاں کہ مجھے کام بہت ہے۔

(۲۱ مارچ ۱۹۷۹ء)

۱۵۔ سردار جعفری

ہاں، غالبؔ خلوت نشیں، ہیسے چناں بیسے چنیں
جاسوسِ سلطاں در کمیں، مطلوبِ سلطاں در بغل

(۱۶ اپریل ۱۹۷۹ء)

۱۶۔ قتیلؔ شفائی (پاکستان)

دو گھڑی آؤ مل آئیں کسی غالبؔ سے قتیلؔ
حضرتِ ذوقؔ تو وابستہ ہیں دربار کیساتھ

(۱۹ ستمبر ۱۹۷۹ء)

۱۷۔ ضمیر نیازی (پاکستان)

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

(۲۸ ستمبر ۱۹۷۹ء)

۱۸ قرۃ العین حیدر

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ (اقبال)

غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے۔

(۱۲ر فروری ۱۹۸۰ء)

۱۹ ریاض الرحمٰن ساغر (پاکستان)

غالب کسی ایک قوم کسی ایک دور کسی ایک خطۂ ارض کا

شاعر نہیں ہے۔ غالب پوری کائنات کا ہم زبان و ہمسفر ہے۔

(۱۳ر مارچ ۱۹۸۰ء)

۲۰ انتظار حسین

میں نے ناصر کاظمی سے پوچھا تھا اور اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ

غالب کے یہاں خالی نالۂ عندلیب کیوں ہے، کوئل کی آواز

کیوں سنائی نہیں دیتی۔

(۱۶ر اپریل ۱۹۸۰ء)

۲۱ کنہیا لال کپور

قرض کی پیتا تھا مے لیکن تھا اتنا جانتا

رنگ لائے گی مری غالب پرستی ایک دن

(۱۶ر اپریل ۱۹۸۰ء)

۲۲ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

غالب کی معنی آفرینی کو سب تسلیم کرتے ہیں، لفظ اس کے ہاتھ میں

آکر معنی کی پھلجھڑی بن جاتا ہے۔ لیکن غالب کی کئی نفسیاتی جہات ایسی ہیں

جن کی پرتیں وقت کے ساتھ ساتھ کھلیں گی یا شاید ہر عہد غالب میں

اپنا غالب تلاش کرے گا۔

(۱۶ر اپریل ۱۹۸۰ء)

۲۳ احمد ہمیش (پاکستان)

غالب اپنے خطوط کی رو سے اُردو فکشن کا بانی ہے۔
اس طرح غالب اردو کا پہلا افسانہ نگار ہے، محض یہ
کہنا کہ وہ بڑا شاعر ہے، کافی نہیں، وہ بڑا افسانہ نگار بھی ہے۔

(۱۶ اپریل ۱۹۸۰ء)

پہلے ۹ حضرات کے بارے میں میں نے جمیل صاحب سے پوچھا تھا کہ ان سے یہ تحریریں کس شہر اور کس مقام پر حاصل کی گئیں۔ انہوں نے بالتفصیل بتایا تھا، مگر مجھے اس میں سے جو کچھ یاد ہے وہ یہاں لکھے دیتا ہوں۔

مولانا محمد طیب[1]، ہمیش پرشاد[2]، آل احمد سرور[3] (بمبئی میں)۔ آرزو لکھنوی[4] (جمیل صاحب کے مکان واقع محمد علی روڈ پر) مالک رام[5]، علامہ کیفی[6]، قادری زور[7] (یاد نہیں) رشید احمد صدیقی[8]، مختار الدین احمد[9] (علی گڑھ میں)

کالی داس گپتا رضا[10]، سید جمیل الدین بغدادی[11] (میرے دفتر واقع نیومیرین لائنز بمبئی میں) ڈاکٹر گیان چند[12] (میرے گھر واقع نیپئن سی روڈ بمبئی پر) قاضی عبدالودود[13] (قاضی صاحب کے مکان واقع بھنور پوکھر پٹنہ پر) ڈاکٹر عابد رضا بیدار[14] (تنسکار ہوٹل پٹنہ میں)، سردار جعفری[15]، قتیل شفائی[16]، ضمیر نیازی[17]، قرۃ العین حیدر[18]، ریاض الرحمٰن ساغر[19]، انتظار حسین[20]، کنہیا لال کپور[21]، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ[22]، احمد ہمیش[23] (میرے گھر واقع نیپئن سی روڈ بمبئی پر)۔

اب آگے بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہے کہ نہیں دیکھنا چاہیئے۔

بیاضِ رفعت

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

مولانا ابوالفضل محمد عباس شروانی رفعت[1] مذہباً شیعہ تھے۔ ۳۰ مئی ۱۸۲۶ء

کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ مشہور عالم شیخ احمد عرب یمنی شروانی (وفات ۱۸۴۰ء بمقام پونا)

کے بیٹے تھے۔ عربی اپنے والد ماجد اور فارسی میر خیرات علی خاں مشتاق فیض آبادی شاگرد

شیخ علی حزیں سے پڑھی۔ والد کی وفات کے بعد ۱۴ سال کی عمر میں اپنے چچا سے ان بن

ہو جانے کی وجہ سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ دکن تک کا سفر کیا۔ پھر دلی آگئے۔ بہادر شاہ ظفر

کے دربار سے مرزائی، خانی اور ابوالفضل دوراں کے خطاب عطا ہوئے۔ انھیں ایام میں

غالب سے ملاقات ہوئی اور شاگردی اختیار کی جو فارسی کلام کی اصلاح تک ہی محدود رہی

دلی سے نکلے تو بھوپال پہنچے اور سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ کچھ عرصے سرکاری ملازمت

چھوڑ کر تجارت بھی کرنے لگے تھے لیکن جب سید محمد صدیق حسن خاں کا دور دورہ ہوا تو

پھر ریاست کے ملازموں میں شامل کئے گئے محکمہ تنظیمات شاہجہانی (یعنی قانون اور تاریخ

نویسی) ان کے سپرد رہا۔ سو روپے ماہانہ مشاہرہ مقرر رہا۔ ۱۳۱۵ھ (۹۷-۱۸۹۸ء) میں

بھوپال ہی میں انتقال ہوا۔

رفعت کی عربی فارسی کی استعداد بہت اچھی تھی۔ اردو ادب، علم کلام اور تاریخ

میں مشہور زمانہ تھے۔ تصنیفات کی صحیح تعداد معلوم نہیں مگر کہا جاتا ہے کہ تقریباً ۶۰ کتابیں

لکھیں۔ آدھی مطبوعہ ہیں۔ اور باقی ماندہ غیر مطبوعہ۔ کئی کتابوں کے صرف نام ملتے ہیں۔ بیشتر اصل

نسخے ناپید ہو چکے ہیں۔

یہاں جس تصنیف (بیاض رفعت) کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہ ان تمام کتابوں یا

رسالوں کے علاوہ ہے جو آج تک معلوم ہو چکے ہیں۔ اس بیاض کا ذکر میں اپنی کتاب متعلقات

غالب میں کر چکا ہوں۔ اور شاید دو ایک متفرق مضامین میں بھی اسے بطور حوالہ استعمال

کیا ہے مگر اس کا تفصیلی حال آج تک شائع نہیں کیا جا سکا۔ آج اس کے بعض

---

[1] سرور تخلص بھی کرتے تھے۔

حصّے نذرِ احباب کرتا ہوں۔ بیاض میرے کتب خانے کے غالب گلگشن میں شامل ہے۔ ۵ × ۹ کے سائز کے نہایت عمدہ اور چکنے ولایتی کاغذ کی یہ بیاض جو ۲۰۸ صفحات کو محیط ہے، رفعت کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ہے۔ ایک جگہ (ص ۱۵۰) یہ الفاظ لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

"اشعار مرزا کمال الدین سنجر[1]۔۔۔۔ شاگرد لسان الملک مرزا تقی سپہر مصنف ناسخ التواریخ دیوان شاہنشاہ ایران ناصر الدین قاچار کہ بسلسلہ سیر وارد ہندوستان شدہ و در بھوپال تشریف آوردہ باحباب والد ماجدم مولانا محمد عباس رفعت دام ظلہ دوستانہ و مخلصانہ برخورد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ خط نوشت۔ جناب ممدوح جواب نوشتند۔ باز مرزا سنجر جو الجواب بر نگاشت و ایں ابیات در صدرہ نوشت خاکسار ابوالقاسم[2] دراں بیاض نقل برداشت[3]۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اس سے معلوم ہوا کہ یہ راقم ابوالقاسم محتشم (رفعت کے صاحبزادہ کلاں) کے قلم سے لکھی ہیں اور یہ خط صاف پہچانا جاتا ہے متن تقریباً ۴ × ۷½ انچ تک محدود ہے۔ گویا لمبائی میں دونوں طرف ایک انچ اور چوڑائی میں آدھ انچ کا حاشیہ بیشتر خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔
یعنی

---

[1] انھیں مرزا کمال الدین سنجر نے مولانا رفعت کے والد کے انتقال پر دو تاریخی قطعے کہے تھے مادے یہ تھے
(۱) آہ مرگِ ابوالفضل کمال (۱۳۱۵ھ) (۲) صد وائے بو الفضایل مرد (۱۳۱۵ھ)

[2] رفعت نے دو صاحبزادے یادگار چھوڑے۔ ایک ابوالقاسم جن کا تخلص محتشم تھا۔ دوسرے ابوالحسن جن کا تخلص محترم تھا۔

[3] یہ خط اور جواب الجواب منظوم ہیں اور فارسی میں ہیں۔ طوالت کے خوف سے درج نہیں کیے گئے۔ سنجر کے خط کا پہلا شعر یہ ہے۔

اے آنکہ بر بکلکِ تو شد استوار خط
از ہمتِ نہانِ تو شد لالہ زار خط

اوپر تلامذۂ غالب کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے کہ محکمہ تنظیمات شاہجہانی (یعنی قانون اور تاریخ نویسی) رفعت کے سپرد تھا۔ بیاض کے صفحہ ۹۲ اور ص ۱۵۰ پر چار پنکھڑیوں والی ایک مہر ثبت ہے جس میں یہ الفاظ کندہ ہیں۔

مہر محکمہ

عالیہ تنظیمات شاہجہانی

۱۲۹۸ھ

بھوپال

ریاست

"تنظیمات" اور "بھوپال" کی درمیانی جگہ میں ۱۲۹۸ھ کندہ ہے۔ مہر کے نشان کے بالائی حصے پر رفعت کے قلم سے یہ عبارت درج ہے۔

"نقش مہر محکمہ دستور العمل ریاست بھوپال کہ راقم محمد عباس

رفعت افزا اوست"

تحریر بیشتر شکستہ ہے۔ مگر بعض مقامات خوش خطی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ پہلا ہی صفحہ اس کی ایک نادر مثال ہے جو یوں شروع ہوتا ہے۔

"اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ

صفحۂ ارژنگ مانی یا بیاضِ رفعت است

تختۂ گلزارِ جنت یا ریاضِ رفعت است"

ایک کونے پر مہر لگی ہوئی ہے "شیعۂ آلِ محمد عباس ۱۲۹۸ھ" یہ سجع ہے جو صفحہ ۲ پر لکھا گیا ہے۔

خوش بود سجع نگینم رفعت

شیعۂ آلِ محمد عباس

پھر اپنے کئی فارسی اشعار دیئے ہیں۔ ایک مطلع لکھا ہے، جس کی اصلاح بھی خود ہی کی ہے۔ (اصل مطلع)

عم با یاران روشن دل بسر بردن خوش است

خلد ایران با ایرانیاں خوردن خوش است

(بعد از ترمیم)

عمر با یاران ہم مشرب بسر بردن خوش است
خلّر[1] شیراز با ایرانیاں خوردن خوش است

حاشیئے میں کہتے ہیں کہ خلّر شیراز کے قریب ایک مقام ہے۔ وہاں طرح طرح کے انگور ہوتے ہیں جن کی شراب کشید کرکے دوسرے شہروں کو بھیجی جاتی ہے، اس لئے شراب کو بھی خلّر کہہ لیتے ہیں۔
اس زمین میں غزل موجود نہیں۔ صرف مطلع اور مقطع ہی دیئے ہیں۔ مقطع یہ ہے۔

پندِ رفعتؔ گوش دار و ہوش کن اے نوجواں
زیستن در اصفہان و در نجف مُردن خوش است

ص ۵ پر قصیدے کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صدیق حسن خاں ۱۲۹۹ھ میں کسی سلسلے میں کلکتہ گئے تھے اور وہاں سے کامیاب ہوکر واپس آئے۔

رفت تا کلکتہ و برگشت باخیر و ظفر
ایں سبب تاریخِ او احسن ظفر آمد پدید
۱۲۹۹ھ

ص ۸ پر درج ہے (۱) "بست و پنجم ماہ شعبان روز سہ شنبہ ۱۲۹۷ھ..... آصف جہاں بیگم دختر احمد علی خاں از بطن سلطان[2] جہاں بیگم صاحبہ پیدا شد"
(۲) "وزیر محمد خاں[3] ۱۲۱۷ھ ہوشنگ آباد از والیِ ناگپور گرفتہ بود"
ص ۹ پر قتیلؔ کا ترجمہ درج ہے۔

"۱۲ سالہ پسر در گاہی ہل در دہلی بعہد شاہ عالم مسلمان شد شاہ نام وے مرزا محمد حسن خاں گذاشت۔ وے در خدمتِ مولانا محمد باقر کرمان شاہی متخلص بہ شہیدؔ علم و ادب آموخت و در ہفت سال در عربی و فارسی و ترکی ذی استعداد شد و تخلصِ خود قتیلؔ کرد۔

---

[1] فرہنگ آنندراج میں غیاث اللغات کے حوالے سے لکھا ہے کہ خلار (بروزن فعول) شیراز کے قریب ایک موضع ہے جہاں کی شراب خوب ہوتی ہے کیا خلّر خلار ہی کی بگڑی ہوئی شکل تو نہیں؟

[2] سلطان جہاں بیگم نواب شاہجہاں بیگم کے بطن سے تھیں اور ان کے پہلے شوہر کی اولاد تھیں۔

[3] وزیر محمد خاں مختارِ ریاست بھوپال متوفی ۱۸۱۶ء

بہ سیر بلدان برآمد و گجرات و دکن را دیدہ وارد لکھنو شد. بسیار

کساں شاگرد وے شدند و شاعر و منشی گردیدند. قتیل مجرد زندگانی

بسر برد. ۲۳ ربیع الاول ۱۲۳۳ھ روز شنبہ وقت صبح در خانہ مرزا

سکندر شکوہ شاگرد خود انتقال کرد. رسایل وے مثل چار شربت

وغیرہ بسیار مشہور اند قولہ

نور تجلی شعلۂ رویت، دور لطیفش، زلف چلیپا

صبح قیامت چاک گریباں، فتنۂ دوراں، قامت زیبا"

جاگیردارانہ نظام میں عیش پرستی کو بے حد دخل رہا ہے۔ چنانچہ فحش مذاق سے اچھی اچھی محفلیں بھی خالی نہ تھیں۔ خلوت خاص میں تو رنگ ان عیاشیوں اور لطیفہ گوئیوں کے بغیر جمتا ہی نہ تھا۔ 'بیاض رفعت' میں بھی جہاں رفعت ایسے اشعار درج کر کے اپنے مذہب سے مطمئن نظر آتے ہیں ؎

کافی ست مرا پیروی آل محمدؐ

دیگر بکسے ہیچ سر و کار ندارم (ص ۲)

وہاں شاہ اجمل الہ آبادی سے متعلق ایسا لطیفہ بھی بیان کر جاتے ہیں۔

ص۔۱

"رمضان کے مہینے میں اجمل معتکف ہوئے۔ شاہ عبدالعلیم جو کہ ان کے بھائیوں میں سے ایک تھے مسجد میں نماز گذارنے کے لئے آئے۔ اتفاق سے شاہ اجمل کا گوز نکل گیا۔ شاہ عبدالعلیم نے فی البدیہہ کہا ؎

۱؎ ظاہر ہے کہ یہاں شاہ عالم سے مراد مرزا عبداللہ علی گوہر شاہ عالم ثانی ہے۔ شاہ عالم ۱۷۵۹ء میں تخت نشین ہوا۔ ۱۷۸۸ء میں اندھا کر دیا گیا۔ اور ۱۸۰۶ء میں مرا۔ قتیل ۱۷۵۸ء۔ ۱۷۵۹ء میں شاہجہاں آباد میں پیدا ہوا اور ۱۸۱۸ء (۲۱ر جنوری) کو لکھنؤ میں فوت ہوا۔ گویا جب شاہ عالم کو اندھا کیا گیا اسوقت قتیل کی عمر تقریباً ۳۰ سال تھی۔ اس طرح قتیل کا بعمر ۱۱ سال جو درست نہیں معلوم ہوتا) یا ۱۸ سال (مصحفی) تبدیل مذہب کرنا یقیناً شاہ عالم کے عہد میں ممکن ہے بلکہ یہ کہ خود بادشاہ نے اسے محمد حسن خاں نام دیا، مزید ثبوت چاہتا ہے۔ بقول مصحفی (عقد ثریا) قتیل نے جو اس وقت دیوانی سنگھ (دلوانی سنگھ) کے نام سے جانا جاتا تھا فیض آباد میں مرزا محمد باقر شہید اصفہانی کے ہاتھوں بعمر ۱۸ سال اسلام قبول کیا۔

مسجد زگو زِ معتکفاں پر بر آمدہ
ایں خانہ خداست کہ بربادی رود[1]

اسی صفحہ پر نواب صدیق حسن خاں کی تصنیف 'ابجد العلوم' کا تاریخی قطعہ بھی درج ہے۔ نواب موصوف کی یہ کتاب کبھی دیکھنے میں نہیں آئی[2] چند اشعار قطعہ درج کئے جاتے ہیں ؎

"دلچسپ و مفید خوش کتابے — کز دیدن اوست قلب مسرور
موسوم بہ ابجد العلوم است — در رنگے مثالِ دُرِّ منثور
تصنیف نمود طبع فرمود — سرحلقۂ عالمانِ مشہور
علامہ عصر چوں سیوطی — در ہند و عرب بفضلِ مذکور

- - - - - -

نواب کریم شاہ مکنت — صدّیق حسن امیر منصور

- - - - - - - - -

تاریخ تمام ایں صحیفہ!! — جستم زتلاشِ طبع پُر نور
مرقات علوم دانش آموز — فرمود خرد بگو بجمہور

۱۲۹۶ھ

ص ۱۳ پر شاہجہاں بیگم والیِ بھوپال کی کسی تعمیر کے آغاز کی تاریخ ہے۔

للہ الحمد کہ از فضلِ قدیرِ متعال! — شد بنا از سرِ تو بارگہ جاہ و جلال!!
جنّا قصرِ فلک منظر بلقیس حشم! — حضرتِ شاہ جہاں بیگم نوشابہ نوال!!
کرد اندیشہ چو رفعت پے فصلی تاریخ — گفت در گوش ملک کاخ خدیو بھوپال

۱۲۸۶ ف

قاضی محمد صادق خاں اختر کے تذکرے 'آفتابِ عالمتاب' کے بارے میں "بیاض رفعت" خصوصی روشنی ڈالتی ہے۔ چونکہ رفعت خود نواب صدیق حسن خاں، قاضی محمد صادق اختر، مرزا غالب وغیرہ کے ایک حد تک ہم عصر تھے۔ اس لئے انکی یہ تحریریں "چشم دید" بیانات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ملا عبدالمومن دہلوی کے

---

[1] اس مضمون میں جہاں کہیں اقتباسات اردو میں دیے گئے ہیں وہ تمام فارسی سے ترجمہ ہیں۔
[2] محبّی سید حنیف نقوی صاحب خبر دیتے ہیں کہ انہوں نے یہ کتاب دیکھی ہے اور کتب خانہ ندوہ کے کتب خانے میں موجود ہونا چاہئے"۔

ترجمے میں کہتے ہیں۔

"ملا عبدالمومن دہلوی، معروف بملا دوپیازہ ابنِ ملا محمد عبدالولی کو علم و فضل کا بہرہ وافر ملا تھا۔ چونکہ ان کی طبع پر مزاح غالب تھا، اس لئے ان کی علمی استعداد کا چرچا زیادہ نہیں ہوا۔ عمر نظام الملک آصف جاہ والیِ دکن کی رفاقت میں بسر کردی۔ ہنڈیہ میں وفات پائی۔ اس کی تصنیف النامہ مشہور و معروف ہے۔ قاضی محمد صادق اختر[1] تذکرہ آفتابِ عالمتاب میں کہتے ہیں کہ ملا نے لغتِ ترکی میں ایک کتاب اتراکِ عالم گیری بہت اچھی لکھی ہے"۔

پھر ملا کے تین شعر درج کر کے لکھتے ہیں۔

تذکرہ روزِ روشن میں جو کہ مولوی یوسف علی لکھنوی نے تذکرہ آفتاب عالمتاب سے لے کر اپنے بیٹے کے نام تالیف کیا ہے (ملا عبدالمومن دہلوی کے بارے میں) اس قدر زیادہ ہے کہ قریہ ہنڈیہ دریائے نربدا کے قریب قصبہ ہردہ کے متصل واقع ہے اور چیپا نیر سے جو کہ دریائے نربدا کے کنارے آباد ہے اور ریاست بھوپال میں واقع ہے، ایک دن کی مسافت پر ہے اور چیپا نیر بھوپال سے تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ مگر

ص ۲۰ "راقم الحروف محمد عباس رفعت کہتا ہے کہ قصبہ ہنڈیہ چیپا نیر کے قصبے سے دس کوس کے فاصلے پر دریائے نربدا کے کنارے آباد ہے پہلے یہ سلطنتِ نظامیہ میں شامل تھا۔ پھر سندھیا کی ملک میں آیا اور اب ۱۲۶۰ھ سے

---

[1] قاضی محمد صادق اختر ولد قاضی لعل ہگلی (بنگال) کے رہنے والے تھے، مگر لکھنو آ رہے تھے۔ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ غازی الدین حیدر نے ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا تھا۔ تبحرِ علمی اور شعر و سخن کے فن میں یگانہ تھے۔ ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ ہی میں انتقال کیا۔ ان کے ایک تذکرہ شعراء "آفتابِ عالمتاب" کی بڑی شہرت ہے۔ (شاید اس کا مخطوطہ اب کہیں مل گیا ہو) اس کے لئے کہا جاتا ہے کہ بھوپال سے متعدد تذکرے دراصل اس تذکرے کے جز ہیں جو نواب صدیق حسن خاں نے اپنے ہی خاندان کے افراد کے نام بانٹ لیے ہیں۔ مگر تذکرہ "آفتابِ عالمتاب" کا ذکر نہیں آنے دیا۔

انگریزوں کے قبضے میں ہے۔ جب ۱۲۷۶ھ میں میں بھوپال کی طرف آرہا
تھا تو قصبۂ مذکور (ہنڈیہ) میں وارد ہوا معلوم ہوا کہ ملّا دوپیازہ کی قبر قبرستان لبِ
جو" میں مشہور و معروف ہے۔ اور اس قصبے کے رہنے والے اسے ولی مانتے
ہیں اور زیارت کرتے ہیں۔ میں بھی گیا فاتحہ پڑھی۔ قبر پر ایک حجرہ بنا دیا گیا
ہے اور فقیر وہاں حاضر رہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص کامل ولی تھا۔

پھر آگے چل کر رفعت لوگوں کی زبانی بتاتے ہیں کہ یہ شخص ملّا دوپیازہ، ظاہر میں مسخرہ بنا رہتا تھا
اور سپاہ میں نوکری کرتا تھا۔ اب یہ بوڑھا ہوگیا تھا۔ اتفاق سے نظامیہ دکن کا لشکر ہنڈیہ میں وارد
ہوا۔ ملّا دوپیازہ آئے اور نظام سے عرض کیا کہ مجھے ہنڈیہ ہی میں چھوڑ دیا جائے۔ قیامت کے دن گرما
گرم چپاتی تو مہیا کروں گا۔ نظام ہنسا اور اس نے ملّا دوپیازہ کا کچھ وظیفہ مقرر کرکے اسے وہیں چھوڑ دیا۔
اس نے اپنی اہلیہ کا نام بی بی چپاتی رکھ چھوڑا تھا۔ اسکی قبر بھی ملّا دوپیازہ ہی کے پہلو میں ہے قلیان بیگ
خادم دوپیازہ کی قبر بھی قریب ہی ہے۔ رفعت کہتے ہیں کہ ان کی کتاب "النامہ" جو عبید زاکانی کے "النامہ"
کے جواب میں ہے، نظر سے گذری ہے۔ حق یہ ہے کہ بے حد مزاح کے پیرائے میں ہے اور خوب لکھی ہے۔
اسی صفحہ ۲۰ پر نواب شاہ جہاں بیگم کے تاریخی نام یوں لکھے ہیں۔

مسعود بخت بیگم ولقب مشتری قدر
۱۲۵۴ھ ۱۲۵۴ھ = مطابق ۱۸۳۸ء

ص ۲۱ (۱) جمادی الاول ۱۲۸۲ھ میں لکھنؤ کی طوائف ناظمہ مرگئی۔ رفعت نے ایک دوست
کی فرمائش پر تاریخ کہی
"ہائے ناظمہ مرگئی"
۱۲۸۲ھ

(۲) ۶ صفر ۱۲۸۳ھ کو سید غلام مرتضیٰ سارنگ پوری نے بھوپال میں انتقال کیا۔

ص ۲۳ ۲۲ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ کو نواب والا جاہ (نواب صدیق حسن خاں) نے بخار کے
عارضے سے صحت پائی۔ رفعت نے ۹ شعر کا قطعہ کہا ہے۔ ۳ شعر سنیئے:

رفعت کہ ثنا خوان و دعاگوے قدیم ست | چوں بلبلِ شیراز بدیں چہچہہ سر کرد
نواب فلک دبدبہ صدیق حسن خاں | از مہر بہر کس کہ نظر کرد گہر کرد
دستش بسخاوت سحروشام دراز است | جیب و کفِ سایل بعطا معدنِ زر کرد

اپنے چھوٹے صاحبزادے ابوالحسن محرم کے تذکرہ روز روشن کے لئے کہا ہوا قطعہ تاریخ دیا ہے۔ آخری شعر یہ ہے ؎

بتاریخ ایں تذکرۂ محترم
بلندی اختر بدفتر نوشت
۱۲۹۷ھ

ص ۲۵ پر اپنے بڑے صاحبزادے ابوالقاسم خاں محتشم کا قطعہ درج ہے۔ جس میں صدیق حسن خاں کی مدح بھی ہے اور مظفر حسین صبا کے تذکرہ روزِ روشن کی تاریخ بھی ہے۔ آخری شعر سے تاریخ نکلتی ہے۔

از مبدئ فیاضِ ازل سالِ تمامش
القا بدلم گشت کہ "منشورِ مسرت"
۱۲۹۶ھ

ص ۲۷ اپنے استاد مرزا غالب کے ۲ تاریخی قطعے دیئے ہیں جو رفعت نے کسی اخبار سے نقل کئے تھے۔ یہ قطعے غالب کے متداول کلام میں شامل نہیں ہیں میں نے اپنی کتاب 'متعلقاتِ غالب' میں شائع کر دیئے تھے۔ مگر ان کا ماخذِ اول خود غالب کے قلم کی تحریر ہے، جو میرے کتب خانے میں ہے۔[1]

"از کلام استادِ فرخ نہاد، جنت آرام گاہ، مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلی علیہ الرحمہ۔ ایں ابیات در دیوان نیست، از یک اخبار نقل شد تاریخ تولد فرزند نواب بندر سورت

بنواب فرزند بخشید ایزد — شدم طالب اسم تاریخی آں
بپاسخ چنیں گفت غالب کہ یا رب — بماناد سید مہابت علی خاں
۱۲۸۳ھ

ولہ علیہ الرحمہ

زہے نواب بابا خاں بہادر — کہ باشد چشم مشتاق جمالش
ندیدم گرچہ از روے دل فروز — ہمیں فرزند فرخ رخ ہلالش

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "متعلقات غالب" ص ۱۰۵ تا ۱۱۱

بود نواب ممدوح آسمانے | ہمیں فرزند فرخ رخ ہلالش
مبارک روشنی شد جلوہ گستر | ازاں گفتیم فرخ تاب سالش
۱۲۸۳ھ

ص ۳۰ ۱۷ ر رمضان ۱۲۹۷ھ کو حکیم شاکر علی بھوپال میں فوت ہوئے۔

ص ۳۶ انگریزوں نے ۱۸ ر شعبان ۱۲۹۷ھ مطابق ۲۷ ر جولائی ۱۸۸۰ء کو ایوب خاں سے بمقام کشت نخود قریب قندھار پہلی جنگ کی۔

اس لڑائی میں ایوب خاں نے فتح پائی۔ رفعت نے ایک قطعہ لکھا جسکے آخری ۲ شعر یہ ہیں۔

سرِ شام سالار لندن دیار | پنہ گیر شد در دژِ قندہار
خدا درد و نالہ بانگریز داد | سپہدار ایوب را کرد شاد

ص ۳۷ ۱۲ ر اگست (۱۸۸۰ء) کو پھر دوسری بار جنگ ہوئی جس میں جنرل بروک مارا گیا اور فوجِ فرنگ نے شکست کھائی۔ رفعت نے پھر ۵ شعر کا قطعہ کہا۔

ص ۴۰ "میر فضل مولا خاں وحید العصر افضل الشعراء" کے ۸ اشعار دئیے ہیں۔ حاشیہ میں رفعت نے لکھا کہ "فضل راقم الحروف کے خالو تھے"۔ ۲ مطلع سنیئے ؎

خوش موسم است مژدہ بیارانِ غمگسار | صبح وصال می دمد از شامِ انتظار
شامِ ہجراں زمن و زلفِ پریشان از تو | صبحِ ماتم زمن و چاکِ گریباں از تو

ص ۴۲ منشی تفضل حسین عطا نے ۱۲۸۵ھ میں حیدرآباد میں وفات پائی۔

ص ۴۳ اپنے چھوٹے لڑکے مرزا ابوالحسن خاں محترم کی غزل لکھی ہے اور اسکی اصلاح کی ہے۔ کل اشعار ۵ ہیں، ایک قلم زد کر دیا گیا ہے اور باقی ۴ اشعار میں کافی ترمیم کی گئی ہے۔

اصلاح شدہ مطلع سنیئے ؎

ہر کہ دل از نورِ مہر او منور ساختہ
پیشِ وے خورشید رنگِ روے انور باختہ

ص ۴۴ "تاریخ چاہ" جسے سید عبدالقیوم و سید عثمان پسرانِ سید معصوم مرحوم نے سید سلیمان کے باغ میں کھدوایا ؎

(۱) عبدِ قیوم و محمد عثمان | چاہ کندند بباغ سلطاں
سالِ وے کوثرِ شیریں آمد | بر لبِ رفعتِ اخلاص نشاں
۱۲۹۶ھ

(۲) ۱۲۹۵ھ یعنی تقریباً سو سال بعد اسحاق خاں دہلوی کی کوشش سے بعہدِ شاہ جہاں بیگم و نواب صدیق حسن خاں بدھوارا[1] کی مرمّت ہوئی جس پر رفعتؔ نے ۴ شعر کا قطعہ تاریخ کہا۔ آخری ۲ شعر یہ ہیں۔

نوی و تازگی بگرفت از سر باب بدوارا!

سنِ تسعین والف و دو صد و پنج۔ اے سخن سنجاں!

بسعی و کوششِ اسحاق خانِ دہلوی رفعتؔ!

بیایاں آمد ایں تعمیر در ماہ نوشِ شعباں!

(۳) "تاریخ وفات (سیّد غلام محی الدین) والد سیّد غلام مصطفیٰ صاحب الہ آباد

شب یک شنبہ ماہ ذوالحجہ — مات سیّد غلام محی الدین

نادرِ عصر رفت، رفعتؔ گفت — از جہاں در قضائے علیین

۱۲۹۵ھ

ص ۹۴ (۱) آخری شعبان ۱۲۹۶ھ کو متّو جان بہادر بخشی فوج ریاست بھوپال مر گئے۔ ۱۰ رمضان روز جمعہ کو کپتان امیر اللہ خاں پسر بخشی مرحوم کی درخواست پر رفعتؔ نے یہ تاریخ کہی ہے

چوں متو جاں بہادر کرد رحلت

بتاریخش تجسس کرد رفعتؔ

زہے فضلِ عمیم ربِّ عزت

ندا آمد مکرّر لفظ "رحمت"

۶۴۸ + ۶۴۸ = ۱۲۹۶ھ

---

[1] دلیان چھوٹے خاں (متوفی ۱۷۹۴ء) نے بھوپال میں داخلے کے لئے ۲ دروازے بنائے تھے۔ اتوارہ دروازہ پیر دروازہ۔ منگل وارہ۔ بدھ وارہ۔ گنوری دروازہ۔ امامی دروازہ اور ہیرا نا قلعہ دروازہ۔ یہاں بابِ بدوارا سے یہی بدھ وارہ دروازہ مراد ہے۔ (دروازوں کی تفصیل اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ۔ ص ۲۸ سے لی گئی ہے)۔

(۲) منشی امجد علی اشہری[1] متوطن ایٹہ، ملازم ریاستِ بھوپال نے "شش امیر صاحب ملک[2]" کی مدح میں شش رقعہ فارسی میں لکھا اور رفعت سے تاریخ کی خواہش ظاہر کی۔

قطعہ یہ ہے ؎

اشہری منشی عالی فطرت ۔۔۔ زد رقم طرفہ کتابے چو بہشت
سالِ تصنیف بجستم رفعت ۔۔۔ کلک "شش رقعۂ رعنا" بنوشت

۱۲۹۶ھ

ص ۵۳ ۔۔۔ ۲ر شعبان ۱۲۹۶ھ کو نواب صدیق حسن خاں کے بڑے صاحبزادے نورالحسن خاں نے رفعت کو لکھا کہ بزم مشاعرہ مقرر کی جارہی ہے، آپ مشاعرے میں شریک ہوں۔ مصرع طرح بھیج رہا ہوں، مصرع یہ تھا ؎

ترا دیدار ارزانی کہ من از خویشتن رفتم

رفعت نے اس کے جواب میں ۷ بیت اور ایک مطلع فوراً لکھ کر فوراً بھیج دیئے۔ ۷ اشعار کا قطعہ تو معذرت نامہ ہے، جو طرح میں نہیں ہے تاہم ایک مطلع طرح میں بھی لکھ بھیجا تاکہ بُرا نہ لگے ؎

بہ بزم یار پنہانی چو بے تابانہ من رفتم
رقیبم دید و رخ پیچید و گفت از خویشتن رفتم

ص ۶۱ ۔۔۔ رفعت نے سنا کہ میر حافظ علی اندور سے اپنے وطن ہنٹور تشریف لے جارہے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ رفعت نے تاریخ وفات کہی، آخری ۲ شعر یہ ہیں ؎

"شنیدم ز مخبر چو ایں واقعہ ÷ بدل فکرِ تاریخ او بر دمید
ز روئے ادب گفت ہاتف بمن ÷ روانش بفردوس عالی رسید

۵۵۷ ۳۵۲ ۱۱۱ ۲۷۴

= ۱۲۹۵ھ

---

[1] سید امجد علی اشہری، ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ نواب سکندر بیگم کے دور کے آخری دنوں میں تقریباً ۱۴ سال کی عمر میں بھوپال آکر ملازم ہوئے اور ۲۲ سال ملازم رہنے کے بعد ۱۸۸۶ء میں حیدرآباد چلے گئے۔ بڑے عالم فاضل تھے اصل وطن ایٹہ یوپی تھا۔

[2] شاید نواب صدیق حسن خاں کی طرف اشارہ ہے۔

ایک شعر میں میر حافظ علی کو "بہیں دورمانِ شہید" لکھا ہے۔ اس سے میر حافظ علی کا نسب ظاہر ہوتا ہے یعنی سید۔

اس صفحے پر مختلف بحر و وزن میں ۵ اشعار دئے ہیں، جو نہایت فحش ہیں۔

ص ۷۰ اس مضمون کے آغاز میں مرزا کمال الدین قزوینی تخلص سنجر کا سیر کرتے ہوئے ایران سے ہندوستان آنا لکھا جا چکا ہے۔ یہاں رفعت نے سنجر کے بھوپال میں ورود کی تاریخ لکھ دی ہے اور لکھا ہے کہ

"مرزا کمال الدین قزوینی سنجر جو کہ نستعلیق اور شفیعا خوب لکھتے ہیں اور عربی، فارسی، ترکی میں شعر کہتے ہیں، ۲۲ شوال ۱۲۹۷ھ کو ایران سے چل کر ہندوستان کی سیر کرتے ہوئے بھوپال پہنچے، انھوں نے نواب صدیق حسن خاں کی شان میں قصیدے لکھے جو کہ تذکرہ روزِ روشن کے خاتمے پر ثبت ہیں۔۔۔۔۔۔"

ص ۷۲ ایک فحش حکایت بیان کی گئی ہے اس کے نیچے ۵ اشعار کا ایک قطعہ ہے جو رفعت نے ۲۷ شوال ۱۲۹۷ھ کو نواب صدیق حسن خاں کی شان میں نظم کیا۔ مقطع درج کیا جاتا ہے۔

رفعت جادو سخن، اے شہریارِ نام جو،
کشت گلہائے مدیحت در زمینِ آفتاب

ص ۷۳ (۱) "اخبار دبدبۂ سکندری مطبوعہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۹۶ھ برابر دہم نومبر ۱۸۷۹ء" سے ذیل کے اعداد و شمار کے نقل کرتے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کا کتنا رقبہ کن کن اقوام کے زیرِ حکومت تھا۔

"زمین در عمل انگریز ۸ لک ۹۹ ہزار ۳۰۰ سو ۴۱ مربع میل (۸۹۹۳۴۱)
〃 سردارانِ ہند ۵ لک ۷۵ ہزار ۲۰۰ 〃 ۵۵ 〃 〃 (۵۷۵۲۵۵)
〃 فرانسیسی + + ۱۰۰ 〃 ۷۸ 〃 〃 (۱۷۸)
پرتگیز ± ۱۰۰۰ ± 〃 ۸۶ 〃 〃 (۱۰۸۶ ·)

〃 جملہ ۱۴ لک ۷۵ ہزار ۸ صد ۶۰ میل (۱۴۷۵۸۶۰)

(۲) یہاں بتایا ہے کہ ۱۸۷۸ء میں ہندوستان سے انگریزوں کو ۵۸ کروڑ ۹۶ لاکھ ۹ ہزار تین سو ایک روپیہ کی یافت ہوئی۔

ص ۸۳ پر رفعت ایک بڑی اہم خبر دیتے ہیں، چونکہ رفعت نواب صدیق حسن خاں کے ہم عصر تھے اس لیے ظاہر کہ یہ سب کچھ رفعت کی آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

"تذکرہ شمع انجمن نواب والاجاہ (صدیق حسن خاں) نے سروِ آزاد اور دو تین دوسرے تذکروں سے لے کر لکھا ہے سروِ آزاد کی نظم و نثر اس تذکرے میں بیشتر نقل کر دی گئی ہے۔ نگارستانِ سخن بنام نور الحسن و صبح گلشن بنام علی حسن پسرانِ نواب صاحب ممدوح (صدیق حسن خاں) و روزِ روشن بنام پسرِ خود، مظفر حسین صاحب، مولوی یوسف علی نے لکھے ہیں اور یہ تینوں تذکرے اختر (یعنی محمد صادق خاں) کے تذکرہ آفتابِ عالمتاب سے تالیف ہوئے ہیں اور وہ تذکرہ (آفتابِ عالمتاب) جو کہ کم یاب تھا اب غارت ہو گیا ہے۔

محنت دگرے کرد عشرت دگرے دید
تخمے دگر افگندہ خرمن دگرے چید۔

طورِ کلیم تذکرہ اشعار اردو و نثر فارسی، نور الحسن (پسرِ نواب صدیق حسن خاں) محمد خان شہیر[1] نے لکھا ہے اور بزمِ سخن بنام علی حسن (پسر نواب صدیق حسن خاں) صابر حسین صبا[2] سہسوانی سنے . . . . "

---

[1] شہیر پسر مولوی غلام حسین خاں وطن رام پور ۱۸۷۲ء میں بھوپال میں آئے تھے۔ اور وہیں ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء میں وفات پائی۔ بھوپال میں شعر و ادب کو ترقی دینے میں آپ کا بہت بڑا ہاتھ ہے خود نواب صدیق حسن خاں آپکے شاگرد تھے بر کار بھوپال سے افتخار الشعراء کا خطاب ملا تھا، فارسی شعر بہت اچھا کہتے تھے۔ غالب کے شاگرد تھے۔

[2] یہاں ورق کرم خوردہ ہونیکی وجہ سے ٹھیک پڑھا نہیں جاسکتا۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ صابر حسین صبا سہسوانی ہی تھے۔ گویا یہ تذکرہ (بزم سخن) صابر حسین صبا سہسوانی کا لکھا ہوا ہے۔ صبا سہسوانی مشہور شاعر انوار حسین تسلیم سہسوانی کے بھائی تھے۔ علم عروض کے ماہر تھے ۱۲۹۷ھ تا ۱۳۱۳ھ بھوپال میں رہے اور وہیں انتقال کیا۔ نواب صدیق حسن خاں کے ہم جلیسوں میں تھے۔ ولادت ۱۲۵۳ھ

ص ۸۵ پر رفعتؔ کا تذکرہ بزمِ سخن کے لئے کہا ہوا قطعۂ تاریخ ہے۔

جنّدا بنوشت در اردو سلیم[1]

بے بہا و پر فواید تذکرہ

سالِ تالیفِ بہیں بزمِ سخن

گفت رفعتؔ بے زواید تذکرہ

تذکرہ۔ زواید = ۱۲۹۷ھ

ص ۹۲ (۱) "۱۹ رصفر ۱۲۹۸ھ پنج شنبہ کے دن" وقتِ طلوع نہ گھنٹہ روز برخوردار ابوالقاسم (محتشمؔ) کے گھر میں دخترِ نیک اختر پیدا ہوئی اور عقیقہ کے دن اس کا نام آمنہ رکھا"۔

(۲) "۱۲۹۹ھ کے عاشورہ کی رات کو برخوردار ابوالحسن (محرمؔ) کے گھر پر بیٹا پیدا ہوا۔ عقیقہ کے بعد محمد حسین نام رکھا۔۔۔۔"

ص ۹۳ (۱) یہ برہمو سماج کا حال لکھا ہے۔ اس میں رفعتؔ نے راجہ رام موہن رائے کے بارے میں لکھا ہے کہ ۱۷۷۴ء میں بردوان میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳۴ء میں انتقال کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ راجہ رام موہن رائے کرشنا نگر ضلع ہگلی کے پاس ایک گاؤں رادھا نگر میں ۱۷۷۲ء (۲۲ رمئی) کو پیدا ہوئے تھے اور ان کا انتقال انگلینڈ میں، ۱۸۳۳ء (۲۷ ستمبر) کو ہوا تھا۔

(۲) یہ لکھا ہے کہ ۱۸۶۴ء تک برہمو سماج کلکتہ سے لاہور تک پھیل گیا تھا اور آج ۱۸۸۱ء میں بھی ترقی پذیر ہے حتےٰ کہ مدراس میں بعض لوگ برہمو سماجی بن گئے۔

ص ۱۰۲ مرزا کمال الدین سنجر قزوینی ریاست جاورہ گئے ہوں گے وہاں سے فارغؔ[2] کو دس اشعار کا ایک خط لکھا، پہلا اور آخری شعر یہاں درج کیا جاتا ہے۔

گلشن آبادِ جاورہ دیدم چوں نہالے کہ نامِ وے وقواق

---

[1] علی حسن کا تخلص سلیم تھا اور نورالحسن کا کلیم

[2] ۔ فدا علی فارغؔ مراد آبادی۔ تاریخ کہنے میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ بھوپال کی ادبی زندگی میں ان کے دم سے بڑی رونق تھی۔

آنچہ بنوشتہ ام دراین نامہ   بخدا من نگفتہ ام اغراق

ص ۱۰۵ " غرہ (چاند کی پہلی تاریخ) ربیع الثانی ۱۲۹۸ھ کو مولوی حمایت اللہ صوفی کشمیری سے معلوم ہوا کہ کشمیر کے قصبہ اسلام آباد میں حمید اللہ شاعرِ ماہر تھا۔ اُس نے چار نامہ کمالِ بلاغت سے لکھا تھا۔ اس مثنوی سے کچھ متفرق اشعار یادگار کے طور پہ اس بیاض میں درج کئے جاتے ہیں۔"

ایک شعر بطورِ نمونہ

بگل نکہت و چار دہ رنگ داد ٭ بدل دانش و عقل و فرہنگ داد

ص ۱۰۷ شہر سرینگر کشمیر کے محلہ خان یار میں ملا عبداللہ ایک زبردست فاضل رہتا تھا۔ ملا محرم نیشاپوری نے اسکی ہجو میں تین سو شعر کہے۔ ملا (عبداللہ) نے بھی اس کے جواب میں تین سو شعر کہے۔ دونوں قصیدے عجیب و غریب الفاظ و معنی پر مشتمل ہیں۔ یہ تین شعر ملا عبداللہ کے قصیدے سے ہیں (یہاں صرف ایک شعر درج کیا جاتا ہے)

اے پوک خوک طینتِ وے مجرم دلوس

بلقندر غراجہ دگر دنگ قرطبوس

ص ۱۲۲ (۱) ربیع الاول ۱۲۹۸ھ کے انگریزی اخباروں سے خبر ملی ہے کہ زار روس اپنے دار السلطنت میں گاڑی میں سوار جاتا تھا کہ کسی دشمن نے ہاتھ گولہ گاڑی میں پھینک دیا۔ جس سے اس کا ایک پاؤں اُڑ گیا اور جان دے دی۔ یہ واقعہ طلوع آفتاب کے بعد آٹھ بجے، ۱۳ مارچ ۱۸۸۱ء کے مطابق، ۱۲ ربیع الاول ۱۲۹۱ھ میں رونما ہوا۔ اور گیارہ بجے اسنے جان "قابضِ ارواح" کے سپرد کر دی۔۔۔۔۔

(۲) " ۲۵ رجب ۱۲۹۸ھ کو میر حسین علی رسالدار ملازم ریاست اندور، متوطن سارنگ پور سے معلوم ہوا کہ منشی عبدالولی بھوپالی کا سارنگ پور میں انتقال ہو گیا۔ فقط

منشیم، خوش نویس و نقاشم   بخت اگر نیست بر ہمہ شاشم [1]

---

[1] (ترجمہ) میں منشی ہوں، خوش نویس اور نقاش ہوں لیکن اگر نصیبہ میرے ساتھ نہیں تو میں ان سب (اوصاف) پر پیشاب کرتا ہوں۔

ص ۱۲۳ "جب میرے والد کی شیخ امام بخش ناسخ سے ملاقات ہوئی تو میرے والد نے کہا کہ آپ کے اردو اشعار تو میں نے بہت سنے ہیں مگر میں آپکے فارسی کلام کا مشتاق ہوں۔ ناسخ نے فی البدیہہ یہ تاریخ کہی ؎

چوں ملاقی شدم بشیخ احمد
دیدمش معجزہ ز خلق نبی
سالِ تاریخ صحبتش ناسخ
گفت دل "شیخ احمد عربی"

۱۲۴۵ھ

ص ۱۲۴ حضرت نظام الدین اولیا کی ایک رباعی درج کی ہے ؎

از اصل حقیقت خبرے نیست ترا
میداں بیقیں کر لا مکانست خدا
خواہی کہ ترا کشف شود ایں معنی
جاں در تنِ تست کو کجا دار دجا

ص ۱۲۵ ۹ اشعار کی غزل ہے۔ آخر میں رفعت نے لکھا ہے "تمام شد ابیات کمال الدین سنجر قزوینی"، معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر خود سنجر کے اپنے قلم کی تحریر ہیں۔

ص ۱۲۷ یہ نواب صدیق حسن خاں کے رسالے "خطیرۃ القدس" پر رفعت کی تقریظ ہے جو پہلی ذیقعدہ ۱۲۹۷ھ کو لکھی گئی۔

ص ۱۳۰ (۱) "۱۷ ذیقعدہ ۱۲۹۷ھ کو جمعہ کے دن اندور شہر میں ریاست بھوپال کے پرانے ملازم شیخ عبدالرحیم نے بعارضہ بواسیر انتقال کیا۔"

(۲) "۱۲۹۸ھ محرم کے مہینے میں، مولوی محمد حسین صاحب مہتمم دبدبۂ سکندری رام پور سے معلوم ہوا کہ بعد عشرہ ماہ محرم منشی کنج بہاری لال[1] ملازم ریاست رام پور کا انتقال ہوگیا۔ وہ زبردست شاعر اور منشی تھے۔ راقم سے ملاقات تھی۔

---

[1] شاید منشی کنج بہاری لال لائق شاگرد امیر مینائی مراد ہے۔ مختصر ترجمہ "انتخاب یادگار" میں، موجود ہے۔

(۳) "مولوی عبدالرشید کشمیری بھوپال سے برطرف ہوکر جبلپور شہر کو چلے گئے۔ اور بعارضہ سرسام عین جوانی میں، نامۂ زندگانی کو پارہ کردیا۔ ۸ صفر ۱۲۹۸ھ کو انتقال کیا۔

(۴) "۲۴ ربیع الثانی ۱۲۹۸ھ کو محمد حسین پسر شریف حسن نے بھوپال میں انتقال کیا۔"

(۵) "شعبان ۱۲۹۸ھ شیخ عبدالواحد عثمانی نے مجھے بتایا کہ حکیم ابو سعید فاروقی رجب کے مہینے میں بمقام حیدرآباد وفات پا گئے۔ یہ حکیم صاحب طبیب حاذق و منشیِ فائق راقم کے دوستوں میں سے تھے۔"

ص ۱۴۲ "شیریں تخلص کی ایک رنڈی (لولی) .... لکھنو کی تھی۔ نام اس کا بیگا تھا۔ یہ اردو کا مطلع اس کے کلام سے ہے۔

اس نے جب مستی لگائی اور جوبن ہو گیا
مرگ نحل اعجاز اب سے برگ سوسن ہو گیا"

شیریں کے ۴ شعر فارسی کے بھی دئیے ہیں۔

ص ۱۶۴ " اخبارات سے معلوم ہوا کہ ۱۸۸۰ء میں ایک لاکھ صحرائی افریقی مسلمان ہوئے اور چین میں بھی ایک لاکھ لوگ اسلام لائے۔

علی گڈھ کے اخبار میں سید احمد خان نے لکھا ہے کہ جنگِ روم میں ایک ارب دو کروڑ ۶ لاکھ روپے صَرف ہوئے۔ . . .

ص ۱۶۶ (۱) "شوال ۱۲۹۸ھ میں خبر آئی کہ شہر اجمیر میں مولوی نجف علی مؤلف "سفرنگ دساتیر" وفات پا گئے۔"

(۲) "۸ شوال ۱۲۹۸ھ کو حرم علی خاں ناظم ملازمت ریاست بھوپال متوطن

ۛ "سفرنگ دساتیر" کمیاب کتاب ہے۔ اس کے چند نسخے میرے غالب گلشن میں موجود ہیں۔ مؤلف کا اصل نام مولوی محمد نجف علی خاں جھجری تھا۔ کتاب ۱۲۸۰ھ میں " در مطبع سراجی باہتمام عنایت علی" طبع ہوئی۔ کل صفحات ۱۹۴ ہیں۔ آخر میں ۱۴ صفحے غلط نامے اور تقریظوں وغیرہ کے زائد ہیں۔ کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس پر تقریظ "سخن پرور سرمایۂ نازشِ کمال ہنر جناب مرزا اسد اللہ خاں المتخلص غالب المشہور مرزا نوشہ" کی لکھی ہوئی ہے۔

شاہجہانپور بھوپال میں، انتقال کر گئے۔"

(۳) دریائے نربدا سے ایک شنکھ مرغی کے انڈے کی طرح کا برآمد ہوا ہے۔ اگر اس کا رنگ خاکستری یا فاختہ کا ہو تو ہندو اس سے شنکر مراد لیتے ہیں اور اگر سیاہ رنگ کا ہو تو اسکو سالگ رام کہتے ہیں اور پرستش کرتے ہیں۔

ص ۱۷۱ "۱۸ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ کو جمعہ کے دن "یوم عیدِ غدیر" پر میر عظمت اللہ بیخبر بلگرامی کا دیوان ملاحظہ سے گذرا۔ تقریباً دو ہزار اشعار ہیں۔ یہ چند اشعار اس دیوان میں سے نقلِ بیاض کئے گئے ہیں۔ ۔ ۔"

کل ۱۳۰ اشعار بیاض میں درج ہیں۔

ص ۱۷۵

(۱) یکم محرم یوم پنجشنبہ ۱۲۹۹ھ کا دن بلقیس جہاں بیگم کی تقریبِ بسم اللہ کی وجہ سے تعطیل قرار دیا گیا۔ اور شام کو محل میں چراغاں کیا گیا، رسم بسم اللہ ادا کی گئی اور خاص خاص نوکروں کو خلعت دے کر ۸ بجے بوقتِ شب دربار برخاست ہوا۔

(۲) کنکیڈ صاحب اجنٹ بھوپال سیہور سے آئے۔ عرصہ ۲ سال سے رئیسہ[1] نے تعزیہ داری کا رواج ختم کر دیا تھا۔ اور یادِ حسین کی آواز بلند کرنے، ڈھول بجانے یا مرثیہ پڑھنے کی ممانعت کر دی تھی۔ اجنٹ صاحب نے ممانعت کا سبب دریافت کیا تو رئیسہ نے انکار کیا۔ اجنٹ (جان بوجھ کر) عشرہ تک مقیم (بھوپال) رہے۔ اب رئیسہ نے اجازت دینے ہی میں مصلحت دیکھی اور منادی کرا دی کہ ہر آدمی اپنے عقیدے میں مختار ہے۔ اور کہ تعزیہ داری کی ممانعت نہیں ہے۔ لوگ آزاد ہو گئے اور ۱۳۰ تعزیے بنائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(۳) "۲۵ محرم کو نواب گوہر بیگم عرف قدسیہ بیگم جو کہ چند ماہ سے علیل تھیں، انتقال کر گئیں۔ صبح کو وزیر باغ میں دفن ہوئیں۔ جنازے کے ہمراہ تقریباً ہزار آدمی تھے اکثر لوگ روتے تھے۔ بازار وغیرہ تین روز تک بند رہے۔

(۴) ۲۷ محرم کو جمال الدین مدار المہام جو کہ چند ماہ سے بیمار تھے۔ وفات پا گئے

---

[1] شاہ جہاں بیگم والیِ بھوپال۔

اور باغِ دلکشا میں دفن ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"

قدسیہ بیگم و جمال الدین
رخت بستند چو ز دارِ سپنج
بہر تاریخ ایں دو چشمۂ فیض
در دلِ رفعت آمدہ غم و رنج

۱۲۹۹ھ

(۴) "۸ صفر روز جمعہ کو منشی جگل کشور مہتمم دفتر کل انتقال کر گئے ۔"

(۵) " اجنٹ گورنر سنٹرل انڈیا گرفن صاحب اندور سے ۶ صفر کو بھوپال آئے ۔ اور ۳ روز رہ کر بھیلسہ چلے گئے پھر ۱۳ صفر کو لوٹے اور ۱۶ صفر کو واپس گئے ۔"

ص ۱۸۰ " شمس الاخبار مدراس مورخہ ۲۶ محرم ۱۲۹۹ھ سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فوٹو گراف کوئن وکٹوریہ کے عہد میں ۱۸۳۸ء میں لندن میں ایجاد ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"

ص ۱۸۱ " ۱۹ محرم ۱۲۹۹ھ کو رشید الدین خاں شمس الامراء ثالث حیدر آباد دکن میں دس بجے انتقال کر گئے اور برہنہ صاحب کی درگاہ میں دفن ہوئے ۔ "

ص ۱۸۶ (۱) " ۱۶ ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ فوجدار محمد خاں انتقال کر گئے "

(۲) "۲۶ جمادی الاول ۱۲۸۶ھ نواب جعفر محمد خاں نے وفات پائی ۔"

(۳) " حیدر آباد دکن میں ۱۱ جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ کو خورشید جاہ شمس الامراء رابع بنے ۔ یہ صاحب رشید الدین شمس الامراء ثالث کے بڑے بیٹے ہیں ۔ جن کا خطاب پہلے اقتدار الملک و قار الامراء تھا ۔ اور وہ عمدۃ الملک شمس الامراء ثانی ان کے بڑے بھائی تھے ۔ ابو الفتح خاں شمس الامراء اول تھے اور یہ خطاب 'امیر کبیر' کے لفظ کے اضافے کے ساتھ نظام الملک حیدر آباد کے عہد سے اب تک مسلسل چلا آتا ہے ۔ اور جو 'امیر کبیر' ہوتا ہے ، وہ ریاستِ نظام کا رکن رکین ہوتا ہے ۔!"

ص ۱۸۷ (۱) تاریخ خاتمہ تزک افغانی

ایں نامہ زفضلِ ایزدِ پاک — شد ختم براستی و صحت
خوش بود تمام ایں صحیفہ — تاریخ ملیح گفت رفعت

۱۲۹۹ھ

(۲) "۱۶ ربیع الاوّل ۱۲۹۹ھ کو حیدرآباد دکن میں آغا محمد حسن شیرازی انتقال کر گئے۔ اور دائرہ میر مومن علیہ الرحمہ میں دفن ہوئے۔۔۔۔۔۔"

ص ۱۸۹ "حاجی ممولا زوجہ نواب یار محمد خاں والی بھوپال کی پتھر کی قبر جو کہ مسجد حاجی ممولا واقع کنارہ تالاب۔۔۔۔ کے صحن میں تھی پہلی ربیع الاوّل ۱۲۹۹ھ کو نواب والا جاہ (صدیق حسن خاں) کے حکم سے مسمار کر دی گئی۔

ص ۱۹۶ "۲۲ ربیع الثانی ۱۲۹۹ھ کو موضع بڑھانہ نزد دہلی، مولوی عبدالقیوم بن مولوی عبدالحق بخار کے عارضے سے انتقال کر گئے۔ یہ بھوپال میں نوکر تھے ایک موضع کی جاگیر انھیں ملی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب بہت اچھے آدمی تھے اور راقم سے مودّت رکھتے تھے۔

ص ۱۹۹ پر نوابان رام پور کے متعلق دلچسپ اور اہم معلومات[1] دی گئی ہیں۔ جن کا اندراج فائدہ مند ہوگا۔

"

نام	تاریخ ولادت	تاریخ وفات	مدفن
علی محمد خاں	۱۱۱۸ھ	۱۱۶۲ھ	آنولہ
فیض اللہ خاں	۱۱۴۶ھ	۱۲۰۸ھ	رام پور
محمد علی خاں	۱۱۶۶ھ	۱۲۰۹	قتل شد
غلام محمد خاں	۱۱۷۶	۱۲۳۸	نادون
احمد علی خاں	۱۲۰۱	۱۲۵۶	رام پور
محمد سعید خاں	۱۲۰۰	۱۲۷۰	رام پور
یوسف علی خاں	۱۲۳۱	۱۲۸۱	رام پور
کلب علی خاں	۱۲۵۰	تاحال زندہ است و والیِ ریاست است	

کل رقبہ ریاست رام پور ۹۴۵ (مربع) میل "

ص ۲۰۱ پر رفعت کا ۱۱ شعر کا ایک قطعہ ہے جس میں اپنا مقام شاعرانہ اور نواب صدیق حسن خاں (والا جاہ) کا مرتبہ عالی بیان کیا گیا ہے۔ ایک شعر میں غالب کا بھی

---

[1] اطلاعاً عرض ہے کہ میں نے ان معلومات کی تصدیق دوسرے ماخذوں سے نہیں کی۔

ذکر ہے۔ ۳ شعر دیئے جاتے ہیں ؎

بلبلِ شیراز گردیدی بہارستانِ من

وآکہ وشیدا شدی برہر گلِ بستانِ من

قدرِ جوہر جوہری داند چہ داند جو فروش

بود غالبؔ قدرداں از زمرۂ یارانِ من

از کلامِ رفعتؔ شیوا بیاں ابیاتِ چند

مدحِ والا جاہ بشنو اے برادر جانِ من

ص ۲۰۴ " ۱۹ رمضان ۱۲۹۹ھ بروز جمعہ نو بجے رات کو 'دلہن صاحبہ زوجہ حکیم شہزاد مسیح' بھوپال میں ریاست بھوپال کے بڑے جاگیردار کو گرجا گھر میں عیسائیوں کے طریقے سے دفن کیا گیا۔"

ص ۲۰۵ "از کلامِ شیخ فدا علی صاحب المتخلص فارغؔ رئیس مرادآباد

عاشق آیا باغ میں گلفام پاس تھے حنا سے سرخ اس کے پوروے

کی شکایت ہم تو کھائے داغِ ہجر تم رنگو جوں لالہ اپنے پوروے

بولے وہ پونچھے تھے میں نے اشکِ خوں اس کے باعث سے ہیں ایسے پوروے

ص ۲۰۶ " سجع منشی فدا علی فارغؔ ؎

فدائے علی فارغ از غم بود

ص ۲۰۷ " تاریخ ماہِ درخشاں مؤلفہ برخوردار ابوالقاسم محتشم از محمد علی خاں ساکن قصبہ داتھین شاگرد سید اظہر علی صاحب۔

فصلی وہجری دو مصراع بدیع ہاتف ومن گفتہ ام باہم چناں

از برائے سالِ ہجری فرحتا گفتہ ام ماہِ درخشانِ اماں

۱۲۹۹ھ

سالِ فصلی گفت درگوشم سروش گو، کتابِ محتشم زیبِ جہاں

۱۲۸۹ ف

اوپر کے اقتباسات سے ظاہر ہے کہ میں نے بیاضِ رفعتؔ کے ۲۰۸ صفحات کے بعض ضروری مقامات ہی کو قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ حق یہ ہے کہ اگر کوئی پوری

بیاض کو ایڈیٹ کر کے شائع کر دے تو اس سے بہت سے ایسے قصیدے اور اشعار سامنے آجائیں گے جو شاید اب اور کہیں نہ مل سکیں۔ لیکن فارسی کا رواج ختم ہو جانے کے پیشِ نظر اب غالبؔ اسکی کوئی امید نہیں۔

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

مولانا فضلِ حق خیر آبادی کا ایک تاریخی قصیدہ

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

مستقل قیامِ دلّی کے دوران غالبؔ کی جن مشاہیر سے شناسائی ہوئی ان میں مولانا فضلِ حق خیر آبادی کا نام اہم ہے۔ مولانا شعر و سخن کا نہایت صاف ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ اس شناسائی نے جو غالبؔ کی سکونتِ دلّی (۱۸۱۲ - ۱۸۱۳ء) اور سفرِ کلکتہ (۱۸۲۷-۱۸۲۸ء) کے درمیان کسی وقت بھی ہوئی، غالبؔ کے رنگِ شعر کو سنوارنے اور نکھارنے میں بڑی مدد کی۔ آگے چل کر یہ شناسائی دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ چنانچہ جب دلّی میں مولانا "حامیانِ تقلید" کے علم بردار بنے اور ان کی "وہابیّت" اور "عدمِ تقلید" کے قافلہ سالاروں شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلوی سے ٹھن گئی تو غالبؔ نے اپنے عقیدے کے باوجود، جو مولانا کے مسلک کے حق میں نہ تھا، مولانا کا ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ ایک فارسی مثنوی بھی لکھ دی۔ یہ مثنوی ان کے کلیاتِ نظمِ فارسی میں موجود ہے۔ جب نواب محمد یوسف علی خاں والئ رام پور ۱۸۵۵ء میں تخت پر بیٹھے تو غالبؔ نے ان سے میل جول بڑھانا چاہا تھا مگر ان کو چنداں کامیابی نہ ہوئی تھی۔ اب اپنے قیامِ رام پور کے دوران مولانا نے غالبؔ کو لکھا کہ ایک قصیدہ نواب صاحب (رام پور) کی خدمت میں بھیجیں۔ غالبؔ نے قصیدہ بھیج دیا۔ جو مولانا کی سفارش سے قبول کیا گیا۔ جواب میں نواب نے ۵ فروری ۱۸۵۷ء کو چند شعر اصلاح کے لیئے غالبؔ کو بھیجے۔ غالبؔ اور مولانا کے انھیں تعلقات کی بنا پر میں نے اس مضمون کو غالبیات میں شامل کیا ہے۔

انیسویں صدی کے پہلے نصف میں بلحاظ علم و ادب جن مشاہیر کا سکّہ چلتا تھا ان میں مولانا فضلِ حق خیر آبادی کا (۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۱ء) نام سرِ فہرست ہے۔ اعلےٰ دماغی صلاحیتوں کے باعث وہ علماء میں مقامِ بلند رکھتے ہیں اور ان کا جلایا ہوا چراغِ علم و فضل آج بھی محلفوں کو جگمگا رہا ہے۔

مگر جہاں وہ بلا شبہ معقولات میں اپنے وقت کے امام سمجھے گئے وہاں کالے پانی کی سزا کے پیشِ نظر انھیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ہیرو بھی قرار دیا گیا۔ اور ان کے اس پہلو سے متعلق ایسی ایسی باتیں گھڑلی گئیں کہ اہلِ تحقیق کی نظر میں ان باتوں کا کسوٹی پر کسا جانا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ اس کام کو پہلے مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اپنے مضمون "مولانا فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد" (تحریک، اگست ۱۹۵۷ء) کے ذریعے اور پھر مالک رام صاحب نے اپنے مضمون "مولانا فضلِ حق خیر آبادی" (تحریک، جون ۱۹۶۰ء) کے ذریعہ پورا کیا۔ اور ثابت کیا کہ نہ صرف مولانا فضل حق نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ وہ آخر تک اس سے اپنی بے تعلقی اور عاید کردہ الزامات سے بے گناہی ثابت کرنے کے لئے پوری تگ و دو کرتے رہے۔

یہ دونوں مضامین اپنی جگہ نہایت مدلل ہیں۔ مضمون کا انحصار مولانا کے اس خط پر ہے جو انھوں نے نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور کو لکھا تھا۔ اور دوسرے مضمون کی پختہ عمارت حکومت کے ان پرانے کاغذات پر کھڑی کی گئی ہے جن میں اصل مقدمے کے کوائف محفوظ ہیں۔

مالک رام صاحب نے مضمون بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور ہر مفروضے کے خدو خال حقیقت کی روشنی میں ظاہر کر دیئے ہیں۔ آج تک یہ مانا جاتا رہا تھا کہ

(۱) مولانا فضلِ حق مرحوم پر مقدمہ جس میں بالآخر انھیں کالے پانی کی سزا ہوئی سلطنتِ مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت کی بنا پر قائم ہوا تھا۔

(۲) منصفِ عدالت مولانا کا شاگرد تھا، اور وہ چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں۔

(۳) جیوری میں ایک اسیسر بھی مولانا کو بری کر دینے کے حق میں تھا۔

(۴) مولانا خود استغاثہ کے بیانات اور دلایل کو "تارِ عنکبوت" کی طرح توڑ دیتے تھے اور وہ اس بنا پر بری کر دیئے جاتے مگر انھوں نے خود اقرار کیا کہ جس فتوے کی بنا پر مقدمہ قائم ہوا ہے وہ صحیح اور میرا لکھا ہوا ہے۔

(۵) اس اقرار واقبال کے بعد عدالت نے "بے حد رنج وغم کے ساتھ" مولانا کے لئے کالے پانی کا حکم سنایا۔

(۶) مولانا نے یہ حکم کمالِ خندہ پیشانی سے سُنا۔

مالک رام صاحب نے مندرجہ بالا تمام دعاوی کا مقدمے کی اصل مسل کو سامنے رکھ کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ

(۱) مولانا نے کوئی ایسا فتویٰ نہیں دیا تھا جس میں لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی گئی ہو۔

(۲) مقدمہ کپتان تھربرن اور اس کے بعد جارج کیمبل اور میجر بارو کی مشترکہ عدالت میں ہوا تھا اور ان تینوں کا مولانا سے شاگردی کا رابطہ ممکن نہیں۔

(۳) یہ عدالت فوجی قسم کی تھی ایسی عدالتوں میں جیوری ہوا ہی نہیں کرتی۔ لہذا اسیسر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۴) مولانا بار بار (مقدمہ کے دوران) یہی کہتے تھے کہ میں نے بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا اور فتویٰ جہاد پر جن علماء کے دستخط ہیں ان میں سرے سے مولانا کا نام ہی نہیں۔

(۵) جو ڈیشیل کمشنر لکھتا ہے کہ مولانا کو سخت ترین سزا ملنی چاہیئے اور انھیں جلاوطن کر دینا چاہیئے۔ عدالت یہ فیصلہ "بے حد رنج کے ساتھ" کیوں سناتی۔

(۶) جب مولانا اپنی پیرانہ سالی اور اپنی اولاد کی صغر سنی اور عسیر الحالی کا دردناک قصہ بیان کر کے حکومت سے رحم کی التجا کرتے ہیں کہ مجھے رہا کر دیا جائے تو وہاں "خندہ پیشانی" سے فیصلہ سننے کا کیا مقام ہے۔

مالک رام صاحب تمام داستانی باتوں کی تغلیط کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

> "آج تک ان (مولانا) کی نسبت جو غلط باتیں مشہور رہی ہیں دراصل یہ نتیجہ تھیں ہماری اس خواہش کا کہ ہم انھیں ..... 'جنگِ آزادی' میں بھی برابر کا شریک دیکھنا چاہتے تھے ..... اب کہ حقیقت واشگاف ہو کر ہمارے سامنے جلوہ فروز ہو گئی ہے ہمیں اپنی گذشتہ غلطیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہیئے ..... مرحوم کی صحیح عزت اسی میں ہے کہ ہم انھیں (مولانا کو) ان کے صحیح مقام پر بٹھائیں، نہ کہ غلط باتیں ان سے منسوب کر کے ان کا ایک فرضی بت بنائے رکھیں جو ممکن ہے خوبصورت تو ہو لیکن اصل سے اس کا کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہوگا ..."

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مالک رام صاحب کا یہ مضمون نہایت مفصل ہے جسے پڑھے بغیر مقدمے کی تفصیلات اور مولانا کے عاجزانہ اور ملتجیانہ بیانات جن میں بار بار اپنی بے گناہی جتائی گئی ہے اور رہائی کی درخواست کی گئی ہے۔ گرفت میں نہیں آسکتے اور چونکہ یہ سب تحریریں

حکامِ وقت اور مولانا یا ان کے وکیل کا دستخطی ہیں اس لئے ان کی صحت قطعی مشکوک نہیں[1]۔

اب صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک مولانا فضل حق خیر آبادی اور ان کے مقدمے اور مآل کار کالے پانی کی سزا کا تعلق ہے، عام روایتیں نادرست ہیں۔ عرشی صاحب اور مالک رام صاحب نے ایمانداری سے تحریری شہادتیں پیش کر کے ثابت کر دیا کہ مقدمے کے دوران اور اس کے بعد انتقال (۱۸۶۱ء) تک مولانا نے صورتحال کا جیسا بھی مقابلہ کیا اسے بہادرانہ نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح اس عرصے میں انھوں نے جو بھی بیان دئے وہ متہوّرانہ بیانات میں شمار نہیں کئے جاسکتے۔ تاہم میری ذاتی رائے ہے کہ مقدمے اور مابعد کے رویّے سے قطع نظر جو میرے خیال میں مولانا نے اپنی جان بچانے اور رہائی حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا تھا وہ "جنگِ آزادی" سے پورے پورے متاثر تھے۔ انھوں نے اس جنگ میں عملی طور پر حصّہ لیا ہو کہ نہ لیا ہو لیکن وہ جذباتی طور پر جنگ آزادی سے قطعی ہم آہنگ تھے اور فرنگیوں کی مخالفت میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ اس کا ثبوت مولانا کا وہ قصیدہ فراہم کرتا ہے جس کے اقتباسات آگے چل کر پیش کئے جائیں گے۔ یہاں مرثیہ کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ چند سنین کی تفصیل درج کر دی جائے۔

جب ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں "جنگ آزادی" کا آغاز ہوا تو مولانا فضل حق خیر آبادی الور میں تھے۔ ۱۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو الور میں مہاراجہ بنے سنگھ کا انتقال ہو گیا اور بقول مولانا وہ مہاراجہ کی وفات کے ایک ماہ بعد یعنی ۱۵ اگست ۱۸۵۷ء کو دہلی کے لئے روانہ ہوئے جیون لعل اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ مولانا ۱۶ اگست (عبداللطیف کے مطابق ۱۹ اگست) کو بہادر شاہ ظفر کے دربار میں شامل تھے اور انھوں نے نذر پیش کی۔ اسی زمانے میں مرجان

---

[1] مولانا لارڈ کیننگ وائسرائے اور گورنر جنرل کو ایک درخواست میں لکھتے ہیں۔

"اب میری عاجزانہ درخواست ہے کہ جو کچھ صدر میں سپیشل کمشنروں کے فیصلے کے خلاف قانون ہونے سے متعلق لکھا گیا ہے اس پر غور کیا جائے۔ مجھے یقین ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خواہ شاہی اعلان کے مطابق انصاف کیا جائے یا ایک پیرانہ سال بوڑھے اور اس کے متعدد بے بس افرادِ خاندان پر رحم کو مدّنظر رکھا جائے۔ بہرحال میری رہائی اور جائداد کی بحالی کے احکام صادر فرمائے جائیں گے۔"

لارنس پنجاب سے کمک لے کر دلّی پہنچے۔ ۱۴ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب انگریزی فوج فاتح ہو کر دلّی شہر میں داخل ہوئی تو مولانا شہر ہی میں موجود تھے۔ پانچ دن تک شہر کے گلی کوچوں میں دست بہ دست مڈبھیڑ ہوتی رہی اور آخر کار ۱۹ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر مکمل طور پر انگریزی فوج کے قبضے میں آگیا۔ بقول مولانا پانچ دن بعد وہ ۱۹ستمبر یا ۲۴ستمبر ۱۸۵۷ء کو خدا پر بھروسہ کر کے بیوی[1] بچوں کو ساتھ لے (الور کو) چل کھڑے ہوئے"۔ سارا ساز و سامان اور کتابیں اور مال وغیرہ یہیں (دلّی میں) چھوڑا"۔ اہل و عیال کو الور میں چھوڑ کر مولانا نے دسمبر ۱۸۵۷ء میں خیرآباد کی راہ لی۔ خیرآباد کے علاوہ چندے کھیڑی، ہرگاؤں، تنبول، سہورا، پور، دریّہ وغیرہ میں رہے اور ۲۶دسمبر ۱۸۵۸ء کو انھوں نے سبیہا کے مقام پر کرنل کلارک سے ملاقات کی جنھوں نے حکم دیا کہ مولانا کو ڈپٹی کمشنر ضلع کی تحویل میں دے دیا جائے۔ مولانا ۳۰دسمبر ۱۸۵۸ء کو ڈپٹی کمشنر کے سامنے حاضر ہوئے اور اپنے مکان ہی پر ٹھہرے رہے۔ جنوری ۱۸۵۹ء کو ڈپٹی کمشنر نے انھیں لکھنؤ روانہ کر دیا۔ مقدمہ ۲۲ فروری ۱۸۵۹ء کو کپتان تھربرن (لکھنؤ) کی عدالت میں پیش ہوا۔ ۴مارچ ۱۸۵۹ء کو مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا۔ مئی ۱۸۵۹ء میں انھیں لکھنؤ سے مختلف جیلوں میں رکھتے ہوئے کلکتہ پہنچایا گیا اور وہاں سے فائر کوئین FIRE QUEEN نامی جہاز میں انڈیمان بھیج دیا گیا۔ جہاز ۸ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پورٹ بلیر پہنچا۔ ایک سال دس مہینے تیرہ دن بعد ۲۰ اگست ۱۸۶۱ء کو مولانا نے وہیں انتقال کیا۔

میرے کتب خانے میں عربی کی ایک قلمی کتاب ہے جس میں سات چھوٹے بڑے رسائل شامل ہیں۔ جن کو مصنّفین کے اصلی خطی نسخے سے نقل کیا گیا ہے[2]۔ ان میں مولانا فضل حق خیرآبادی کے چھوٹی بڑی بحروں میں ۱۶ قصیدے ہیں۔ ۳ قصائد نونیہ ہیں۔ ایک قصیدہ نونیہ کا موضوع انگریزوں کے ہاتھوں دلّی کی تباہی و بربادی اور مصنّف کا دلّی سے نکلنا ہے اور یہاں اسی قصیدے کا لب لباب پیش کرنا مقصود ہے[3]۔ چونکہ قصیدے میں دلّی کی تاراجی کے بعد مولانا کا دلّی سے نکل کر منزل پر پہنچنے کا حال درج ہے اس لیے قیاس کیا

---

[1] دہلی میں مولانا کی ایک بیوی امراؤ بیگم اپنے دونوں صاحبزادوں شمس الحق اور علاء الحق کیا تھ محلہ بلی ماران میں مقیم تھیں۔

[2] کتاب کا مکمل تعارف آئندہ پیش کیا جائیگا۔

[3] اس قصیدے کے صحیح مفہوم کیلئے ایک عربی عالم سے مدد لی گئی ہے اور وہی اسکی صحت کے ذمہ دار ہیں۔

جاسکتا ہے کہ قصیدہ ستمبر ۱۸۵۷ء کے تیسرے یا چوتھے ہفتے اور دسمبر ۱۸۵۷ء (خیر آباد کو روانگی) کی درمیانی مدت میں کہا گیا ہے۔ اگر قصیدہ خیر آباد پہنچ کر کہا گیا ہوتا تو اس میں خیر آباد کے سفر کا حال بھی درج ہوتا۔ اس لئے قصیدے کی تاریخِ فکر اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۷ء مقرر کی جاسکتی ہے۔

قصیدہ

میں اپنے معشوق کے ساتھ، جس کے حسن و کمال کی توصیف ممکن نہیں، بڑی پُر مسرت زندگی گذار رہا تھا کہ اچانک ایسے حادثات گذرے جو میرے اس کے درمیان حائل ہو گئے اور وصل کے تمام اسباب منقطع، راہیں مسدود ہو گئیں۔ محبت کی باتیں کہانی بن گئیں اور طوفان نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا وہ طوفان یہ ہے کہ نصاریٰ تمام دنیا کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے مدعا کو سینے میں چھپائے، حیلوں، بہانوں سے دینِ عیسوی کو پھیلانے اور بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ ہر عہد کو توڑ دیتے ہیں اور فریب و ضلالت پر کمربستہ ہیں، جس ملک کو غصب کرتے ہیں ظلم و طغیان میں حد سے گذر جاتے ہیں۔ کمینوں، ذلیلوں، کو ابھارتے ہیں تاکہ شریف ختم ہو جائیں اور مدرسے بناتے ہیں تاکہ بچے بگڑ جائیں ان کے مدرسوں میں لغویات، مکروہات، بہتان، عیاری، و مکاری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انہوں نے تمام لوگوں کا رزق چھین رکھا ہے چاہے وہ صناع ہوں کہ کاشت کار ان کا فیصلہ فریقین کا مال سلب کر لیتا ہے اور ان بے چاروں کو حزن و ندامت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ جب ان مکاروں نے شاہان ہند کو لہو و لعب میں مشغول اور کمزور وسست پایا تو آہستہ آہستہ ملک پر چھا گئے۔ اور جب یہ جان لیا کہ حالات موافق ہیں تو اپنے لشکریوں کو کھلم کھلا تثلیث کی طرف دعوت دینی شروع کر دی۔ فوجیوں میں اکثر ہندو تھے اور تھوڑے مسلمان لیکن دونوں کی حمیت نے نصاریٰ کے قدم روک دیئے۔ ان انگریزوں نے ان ہندو مسلمانوں کو گائے اور سور کی چربی کھانے پر مجبور کیا تاکہ دونوں فرقوں کے لوگ بے دین ہو جائیں اور ہماری طرف آجائیں، کیونکہ ایک فرقہ گائے کو 'پوجتا' ہے اور قرآن کے ماننے والوں کے یہاں سور نجس العین اور شیطان کی گندگی مانا جاتا ہے۔ چنانچہ جب ان لشکریوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کیا تو انگریزوں نے ان پر سختی و تشدد کے آ ے

کو آزمایا۔ لشکریوں نے جواب میں الٹا ان ہی کو دھر لیا اور ان کی طرف اسلحے لےکر پلٹ پڑے۔ چنانچہ لشکر کے بہت سے سردار قتل کر دیئے گئے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی عورتوں، بچوں، وغیرہ کسی کا لحاظ نہ کیا۔ سب کو مارا، زخمی کیا، اموال لوٹے، مکانات جلائے اور اسطرح ملک ہند میں افراتفری وانتشار عظیم پیدا ہوگیا۔ کوئی حاکم رہا نہ نگراں، سب کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ جان، مال، ناموس، آبرو کسی کے تحفظ کا سہارا نہ رہا۔ عجیب ہڑبڑ مچا اور امن وسکون تہ وبالا ہوگیا۔ غنی مفلس ہوگئے اور مفلس مالدار۔ عزت والے بے عزت اور کمینے معزز وبارعب۔ غرض کہ سب الٹ پلٹ ہو گیا۔ امن وامان کا خاتمہ ہوگیا۔ فتنہ پھیلتا گیا اور اب تمام لشکری ایک بزدل وکمزور شخص کے گرد جمع ہوگئے جس کا نام بہادر شاہ تھا اور دہلی پر قبضہ کر لیا۔ ان کے ارادے غیر مستقل، اندازے غلط وبے سود۔ نہ ان میں دین نہ ایمان جو نظر آیا اسے لوٹ کھایا۔ ایک بڑا گروہ زناکاری میں لگ گیا۔ اور ہزاروں عورتوں کی عزت وناموس پر ڈاکا ڈال کے ان کو بدکار بنادیا۔ پیشہ ور بدکار عورتوں کی چاندی ہوگئی ان کا حکم چلنے لگا۔ کچھ صرف مال جمع کرنے پر ادھار کھائے ہوئے تھے تو کچھ بھوکے پیاسے اور تباہ حال۔ بعض ان میں اسلحہ کا استعمال بھی اچھی طرح نہ جانتے تھے۔ ادھر یہ دھینگا مشتی مچی ہوئی تھی۔ ہر کوئی اپنے میں مست تھا۔ دوسری جانب نصاریٰ خندق کھود رہے تھے اور فصیلیں بنا رہے تھے۔ انہوں نے اونچی اونچی پہاڑیوں پر پہنچ کر دمدمے نصب کر دیئے اور افواج کثیر کو چاروں طرف پھیلا کے شہر دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد آتشیں اسلحہ بندوق وتوپ وتفنگ کا کمال دکھلانے لگے۔ شہر دھوئیں سے بھر گیا۔ ہر طرف آگ آگ بھاگ بھاگ مچا ہوا تھا۔ ہزاروں افراد بھسم ہوگئے، مارے گئے زخمی ومعذور لوگوں کا کچھ حساب نہ رہا۔ افسوس کہ لشکرِ دہلی میں کچھ مخلص مجاہدین بھی تھے۔ لیکن ان غریبوں کے پاس تھا کیا؟ نہ لباسِ جنگ، نہ رسد، نہ اسلحہ۔ بیچارے تلوار اور گھوڑے لے کر لڑنے آئے تھے۔ انہوں نے بہت سخت جہاد کیا اور اللہ کی رضا کے مستوجب ہوئے لیکن قدیم آلات جنگ کے باعث ہزیمت اٹھائی۔ ان کے علاوہ باقی لشکر زیادہ دیر ٹک بھی نہ سکا۔ اور تتر بتر ہونے لگا۔ فرار کی صورتیں ڈھونڈھنے لگا۔ انگریزوں نے یلغار شروع کر دی اور حال یہ تھا کہ جسے پاتے موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ انگریزی فوج درانہ چلی آتی تھی اور قتل وغارت کا بازار گرم تھا۔ دہلی والوں نے یہ سماں دیکھا تو بھاگنا شروع کیا۔ اور اس کے بعد لوٹ مار، قتل وغارت، بے رحمی، وشقاوت کا وہ حال ہوا جو بیان نہیں کیا

جا سکتا۔ گھروں کو ڈھا دیا گیا۔ عمارتیں توپ سے اڑا دی گئیں۔ راستے ویران بنا دئے گئے۔ درخت تک آگ میں جھلس گئے۔ وہی لوگ بچ گئے جو بھیس بدل کر چھپ چھپا کر، راتوں رات بھاگ لیئے، ورنہ پورے شہر دہلی کے باشندے دشمنوں کے قیدی بن گئے اور قبرستان جیسا خوف اور سناٹا کئی روز تک طاری رہا۔ ہائے ہائے نصاریٰ پیر پٹکتے اور اکڑتے ناچتے چلتے تھے اور ہر گلی کوچہ میں گشت لگاتے تھے اور اہلِ دہلی حیران، سوختہ ساماں، نیم مردنی کے عالم میں آسمان کو تکتے تھے۔ باپ بیٹے سے دور، بھائی، بھائی سے الگ، بیوی کو شوہر کی خبر نہیں۔ بچے ماں کے لئے روتے پھرتے اور مائیں بھوک اور حزن سے گریاں۔ کھانے کو ماش، پینے کا پانی شور، ہر قسم کی ذلت وصعوبت کا اجتماع، شریف عورتوں کی عصمت وعفت کا خدا ہی نگہبان تھا۔ پردہ دار خواتین کے جسم پر پھٹے ہوئے لباس تھے۔ لیکن ان کو اپنی عریانی کا ہوش ہی نہ تھا۔ بیچاریاں ایک طرف منہ اٹھائے بھاگی جا رہی تھیں۔ کتنی تو راستے میں ہلاک ہوئیں اور نہ جانے کتنی کنوؤں اور دریا میں کود پڑیں۔ کیونکہ نصاریٰ کے لشکری ان کے پیچھے پڑے تھے اور جو بھی مل جاتا اس کے ساتھ شقاوت و بے رحمی کی انتہا کر دیتے تھے۔

بادشاہ قید کر لیا گیا۔ اسکے چار جوان بیٹوں کے سر کاٹ کر اس کے پاس بھیجے اور لاش کو سولی پر چڑھا دیا۔ ملکہ کو قصر کے بدلے قید خانہ آباد کرنا پڑا۔ ان انگریزوں کے ظلم سے کوئی شاید ہی بچا ہو۔ یا تو وہ جس نے بھیس بدل لیا ہے یا کسی قریبی گاؤں میں بھاگ کے چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔ آل تیمور اور جرجان کے بادشاہوں کی اولاد نے ہزاروں کی تعداد میں پھانسی کی سزا پائی۔ نہ کسی عالم کو چھوڑا نہ قدیم نشان کو، نہ قرآن کو بخشا۔ تمام مسجدیں ڈھا دیں سوائے دو ایک کے اور اس میں بھی نماز کی مناہی کر دی۔ شہر کو اس طرح بر[illegible] لیا کہ فر[illegible] والیوان ایک نہ بچا جس نے نصرانیوں کی مدد کی [illegible] اسے آسمان پر چڑھا دیا۔ یہ کم بخت لوگ [illegible] و درندگی [illegible] وشیطنت میں اُن سے بھی دو قدم آگے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ دشمن کسی کو معاف کرنے والا نہیں اور مقابلے کا کوئی سوال نہیں تو میں نے بھی دکھے ہوئے دل سے دہلی کو خیرباد کہا مگر ہر قدم پر خوف تھا کہ نصاریٰ کے جاسوس دھر دبائینگے اس لئے میں نے دور دراز کا راستہ اختیار کیا۔ ناقابل عبور ندیوں کو پار کیا۔ خدا ہی بچانے والا تھا ورنہ جگہ جگہ مجھے دشمن کی آنکھیں گھورتی نظر آتی تھیں۔ جب میں اپنے اہل وعیال سے آملا تو لوگوں نے نذریں اتاریں اور کئی دن تک تہنیت کا سلسلہ چلتا رہا۔

مطالعات و مشاہدات

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

(۱)

درفشِ کاویانی مطبوعات مجلسِ یادگارِ غالبؔ[1] لاہور ۱۹۶۹ء

ص ۸ پر حاشیے میں پروفیسر محمد باقر تحریر فرماتے ہیں :

"اس (قاطعِ برہان کی حمایت اور مخالفت کے) ہنگامے میں منشی جواہر سنگھ جوہر لکھنوی کا کردار عجیب نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو وہ آغا احمد علی احمد کی حمایت میں قطعہ لکھتا ہے، جس سے بظاہر غالبؔ کی مخالفت مقصود تھی اور دوسری طرف وہ قاطعِ برہان کی توصیف بھی کرتا ہے۔ قاطعِ برہان کی طباعت پر جوہر کا قطعہ تاریخ ملاحظہ ہو۔

دریں کتاب مسمیٰ بہ قاطعِ برہان
نگر کہ خانہٗ غالبؔ چہ مایہ گوہر سُفت
بیا کہ جوہرِ رنگیں صغیر بے کم و بیش
نگار خانۂ فرہنگ سالِ طبعش گُفت"

حقیقت یہ ہے کہ جواہر سنگھ جوہرؔ لکھنوی اور جواہر سنگھ جوہرؔ خالقِ قطعہ دو مختلف شخصیتیں ہیں۔ جواہر سنگھ جوہرؔ لکھنوی منشی بختاور سنگھ راقم کے بیٹے تھے۔ اردو میں خواجہ وزیرؔ کے اور فارسی میں گل محمد خاں ناطقؔ مکرانی کے شاگرد تھے۔ ۱۸۸۰ء میں انتقال کیا۔ جواہر سنگھ جوہرؔ خالق قطعہ تاریخ رائے چھجمل دہلوی کے صاحبزادے تھے۔ جہاں جوہرؔ غالبؔ کے شاگرد رشید تھے وہاں رائے چھجمل غالبؔ کے خاص دوستوں میں تھے جس زمانے میں غالبؔ کلکتہ گئے تھے اپنے معاملات کی دیکھ بھال رائے چھجمل ہی کو سونپ کر گئے تھے۔

---

[1] "خانۂ غالبؔ" ہونا چاہئے۔

(۲)

مباحثۂ گلزارِ نسیم یعنی معرکۂ چکبست و شرر

میرزا محمد شفیع شیرازی لکھنوی ۱۹۱۳ء ص ۱۵۸

احمد علی شوقؔ مرحوم (اودھ پنچ ۷ اراگست ۱۹۰۵) رقم طراز ہیں:

"حضرت غالبؔ مرحوم کا دیوانِ فارسی جب منشی نولکشور مرحوم کے مطبع میں چھپنے کو آیا، تب مولوی محمد ہادی علی اشکؔ مرحوم مصحح تھے۔ انہوں نے حضرت غالبؔ کو تحریر فرمایا کہ آپ سے دھوکا ہوگیا ہے۔ یعنی آپ فرما گئے ہیں ؎

بچو نائکہ لب ز زمزمۂ یا ابوالحسن

یہ مصرعہ حضرت غالبؔ مرحوم کے ایک قصیدہ فارسی کا ہے۔ دراصل حرفِ ندا کے ساتھ "ابا الحسن" فرمانا چاہیئے تھا۔ حضرت غالبؔ نے جواب تحریر فرمایا کہ میں نے کہا اسی طرح ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ غلط لفظ اپنی غلط حالت کے ساتھ چھپ گیا اور اب بھی اسی طرح دیوان میں موجود ہے..."

مطبع نولکشور سے غالبؔ کا کلیاتِ نظم (فارسی) پہلی بار ۱۸۶۳ء میں طبع ہوا۔ یہ اسی اڈیشن کا ذکر ہے۔ اس کے "خاتمۃ الطبع" کی عبارت بھی مولوی ہادی علی اشکؔ ہی کی ہے۔ پورا شعر جو کلیّات کے ص ۱۸۴ پر درج ہے، یہ ہے ؎

ساغر پے صبوح لبالب کنم زمے
بچو ناں کہ لب ز زمزمۂ یا ابوالحسن

شوقؔ مرحوم شاید اس مغالطے میں ہیں کہ غالبؔ کی عدم توجہی یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے "یہ غلط لفظ (پہلی بار) اپنی غلط حالت کے ساتھ چھپ گیا"۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر اسی "غلط لفظ" کے ساتھ اٹھارہ سال پہلے چھپ چکا تھا۔ جسے غالبؔ کے دیوانِ فارسی مطبوعہ مطبع دارالسلام شاہجہاں آباد ۱۸۴۵ء کے ص ۱۳۳ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۸۴۵ء میں قصیدے کا عنوان تھا۔ "در منقبت امیر المومنین علی علیہ السلام" اور ۶۳-۱۸۶۸ء میں صرف قصیدۂ پنجم در منقبت"۔
غالب کی عربی دانی کچھ ایسی ہی تھی۔

(۳)

متعلقاتِ غالب۔ کالی داس گپتا رضا۔ بمبئی ۱۹۷۸ء

ص ۱۳۱ پر دیوانِ ذکا (اردو) کے تحت میں نے تفصیل سے لکھا تھا کہ جناب عبدالرزاق بسمل (ذکا کی ہمشیرہ کے نواسے متوفی ۲۷ جولائی ۱۹۶۳ء) اور جناب ضیاء الدین خطیب (بحوالہ سب رس۔ غالب نمبر ستمبر اکتوبر ۱۹۶۹ء ص ۴۶) فرماتے ہیں کہ ذکا شاگردِ غالب نے اپنا اردو کلام جمع کرنے کی کوشش نہ کی اور اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اس خیال کی تردید میں میں نے بتایا تھا کہ ذکا نے اپنا اردو کلام پورے انہماک سے جمع کیا تھا اور اسے مکمل دیوان کی شکل دی تھی جس کا ایک قلمی نسخہ جناب مالک رام کے پاس تھا۔ اور ایک قلمی نسخہ میرے کتب خانے کی زینت ہے اور کہ انھیں اپنے اردو کلام سے پوری دلچسپی تھی۔ جو آخر تک قائم رہی۔ اب تذکرۂ اشاراتِ بینش (مؤلفہ سید مرتضیٰ بینش و مرتبہ شریف حسین قاسمی۔ ص ۴۷) سے مزید انکشاف ہوتا ہے کہ ذکا نے اپنا اردو دیوان اوّل اوّل ۱۷ سال کی عمر میں ترتیب دیا تھا۔

مؤلفِ تذکرہ بینش) ذکا کے اولین اساتذہ میں سے تھے۔ انھوں نے یہ تذکرہ ۱۲۶۵ھ (مطابق ۴۹-۱۸۴۸ء) میں مکمل کیا تھا۔ لکھتے ہیں۔

"...... از روئے انصاف می گویم نہ بپاس شاگردی کہ فی زمانہ عدیلش نمی بینم..... در زبانِ ریختہ ہم دیوانے ترتیب دادہ ..... تاریخ تدوینش 'چشم بینش روشن' یافتم و ذہین[1] نیز بصنعت تعمیہ تاریخش خوب گفتہ ہمہ اشعار ذکا بے عیب است....."

---

[1] ذہین تخلص پورا نام علی دوست تھا حکیم شفا دست خان کے بیٹے تھے۔ ذکا سے سال بھر چھوٹے تھے اور بینش کے تلامذہ میں سے تھے۔

تدوینِ دیوان کی تاریخ "چشم بنیش روشن" سے ۱۲۶۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ اور ذہین کی تاریخ "ہمہ اشعارِ ذکا بے عیب است" سے بھی ۱۲۶۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ (ہمہ اشعارِ ذکا = ۱۳۴۳ اس میں سے عیب = ۸۲ نکالنے سے ۱۲۶۱ھ مستخرج ہوا)۔ ذکا ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۲۶۱ھ میں ان کی عمر صرف ۱۷ سال کی تھی۔ اس عمر میں پورا دیوان ترتیب دے دینے کے معنی یہ ہوئے کہ ذکا بچپن ہی سے انتہائی زرخیز ذہن رکھتے تھے۔

جس دیوانِ ذکا (نسخہ راقم) سے میں نے (متعلقات غالب ص ۱۵۰) انتخابِ کلام اخذ کیا ہے۔ اس میں ایک نظم (مرثیہ غالب) ۱۸۶۹ء کی بھی ہے معلوم نہیں کہ اس میں ۱۲۶۱ھ والا دیوان شامل ہے یا یہ اس کے بعد مرتب کردہ دوسرا دیوان ہے۔ کیونکہ تذکرہ اشاراتِ بنیش میں ذکا کے دیوانِ ریختہ کا کوئی انتخاب شامل نہیں۔ اس تذکرہ کا موضوع فارسی گو شعرا ہیں۔

(۴)

بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب۔ مرزا جعفر حسین لکھنؤ

۱۹۷۸ء

آزاد آبِ حیات میں غالب کے اردو کلام کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"...... دیوان بہت بڑا تھا۔ یہ منتخب ہے مولوی فضل حق صاحب کہ فاضل بے عدیل تھے ...... سررشتہ دار تھے۔ اسی عہد میں مرزا خاں عرف مرزا خانی صاحب کوتوال شہر تھے۔ یہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے ..... انھوں نے مرزا (غالب) صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے ...... انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو کہ ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔"

اس انتخاب کی تائید و تردید میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ یہاں اس سے غرض نہیں۔ صرف مرزا خانی کے تعلق سے ایک عبارت نقل کرنا ہے۔ مرزا جعفر حسین (ص ۱۷۳) لکھتے ہیں:

"مرزا غالب سے ان (مرزا محمد عسکری) کو عشق تھا۔ غالب نے

۱۸۶۹ء میں وفات پائی تھی۔ اور مرزا (محمد عسکری)[1] صاحب اسی سال

غالب کی وفات کے تھوڑی ہی مدت بعد پیدا ہوئے تھے۔ وہ فرمایا

کرتے تھے کہ مرزا غالب کی روح مجھ میں حلول کر گئی ہے ۔۔۔۔ فرماتے

تھے کہ میرے دادا مرزا خاں المعروف بہ مرزا خانی دلی میں کوتوال شہر کے

منصب پہ فائز تھے ۔۔۔۔۔ جید عالم اور مستند ادیب تھے۔ مرزا غالب

نے اپنے اردو دیوان میں کانٹ چھانٹ کا فریضہ جن اساتذہ کے سپرد کیا

تھا ان میں مرزا خانی بھی تھے ۔۔۔۔ ذوق اور شاہ نصیر کے ساتھ

متعدد مقامات پر مرزا خانی کا بھی ذکر آتا ہے شاہ نصیر کے ایک

قصیدے کا یہ شعر انھوں نے مجھے (مرزا جعفر حسین کو) کئی بار سنایا

تھا ۔

نصیر الدین بے چارہ تو رستہ طوس کا لیتا

نہ ہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی

مرزا (محمد عسکری) صاحب فرماتے تھے کہ کچھ مسلح لوگوں نے جو انگریزوں

کے خلاف جہاد کرنے آئے تھے کسی بدگمانی کی بنا پر شاہ نصیر کا گھر گھیر لیا تھا

اور ان (محمد عسکری) کے دادا میرزا خانی نے اس ہنگامے کو فرو کر دیا تھا

یہ شعر اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے ۔۔۔ دلی کی تباہی کے بعد مرزا

خانی لکھنؤ چلے آئے تھے ۔۔۔۔ لکھنؤ آکر اسی مکان میں مقیم ہوئے

تھے جو اب تک عبدالعزیز روڈ پر موجود ہے۔ اور جس میں آج بھی

(۱۹۷۸ء) ان کے پرپوتے مرزا وصی رہتے ہیں ۔۔۔۔ اس وقت یہ ایک

چھوٹا مکان تھا ۔۔۔۔ اب ایک عالیشان املاک ہے "۔

---

[1] یہ وہی مرزا محمد عسکری ہیں جنھوں نے رام بابو سکسینہ کی گراں قدر تالیف کا اردو ترجمہ "تاریخ ادب اردو" کے نام سے کیا ہے۔ "ادبی خطوط غالب" بھی انھیں کی تالیف ہے۔ لکھنؤ میں یہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔

مآثر صدیقی۔ حصۂ دوم۔ نولکشور۔ ۱۹۲۴ء ص ۱۵

"..... زمانہ آغاز ملاقات میں والاجاہ (نواب صدیق حسن خاں) ایک بار میرزا غالبؔ مرحوم کے دولت خانے پر خانۂ بے تکلف سمجھ کر بلا اطلاع سابق یکایک پہنچ گئے۔ اس وقت یارانِ رنگین طبع کی محفل گرم تھی۔ مرزا صاحب نے ان کو دیکھ کر بے ساختہ یارانہ لہجے میں کہاع بیا برادر آ و رے بھائی اس وقت آپکی کیا دعوت کروں پہلے سے مجھ کو آپ کے آنے کا علم بھی نہ تھا۔ خیر بیٹھیے میں ضیافت طبع کئے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر مرزا صاحب نے اپنی تازہ غزل سنائی جو انھیں دنوں میں شاہی دربار کی فرمائش سے لکھی تھی۔ اس کا مطلع یہ ہے ؎

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

والاجاہ (نواب صدیق حسن خاں) اکثر اوقات کہا کرتے تھے کہ مرزا صاحب کا وہ دلآویز لب ولہجہ اور ان کے فصیح و بلیغ اشعار کی حسن ترتیب و ادا اور لطایفِ شعریہ اور جزالتِ معانی کی تاثیر..... دل میں پیوست ہوگئی ہے"

'مآثر صدیقی' نواب صدیق حسن خاں کے صاحبزادے کی تصنیف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ داستان نواب صاحب کی عظمت بڑھانے کے لئے گھڑ لی گئی ہے۔ مگر واقعے اور شعر کے سنین کی مطابقت ظاہر کرتی ہے کہ کچھ افراط و تفریط سے قطع نظر کرکے تمام واقعہ قابلِ قبول ہے۔ اسی کتاب کے ص ۱۸ پر لکھا ہے کہ "اکیس ۲۱ سال کی عمر میں (نواب صدیق حسن خاں... دہلی سے اپنے وطن قنوج میں واپس آئے،" دلی میں دو۲ سال کی عمر میں قیام (ص ۱۳) رہا اور غالب سے ملاقات "زمانہ آغاز" (ص ۱۵) میں ہوئی گویا ۱۹ سال کی عمر میں صدیق حسن خاں نے غالب سے ملاقات کی۔ چونکہ صدیق حسن خاں کی ولادت ۱۸۳۲ء کی ہے۔ لہٰذا ملاقات کا سال ۱۸۵۱ء ٹھہرتا ہے اور اسی سال (اپریل تا جولائی ۱۸۵۱ء) غالب اپنی یہ غزل نبی بخش حقیر کو ایک خط میں بھیجتے ہیں (دیکھیے نادراتِ غالب ص ۱۳) یوں بھی ۱۸۵۵ء (نسخۂ رامپور جدید) سے پہلے یہ غزل غالب کے کسی مطبوعہ یا قلمی مجموعہ کلام میں شامل نہیں۔

کاروانِ خیال۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مکتبۂ احباب لاہور ص ۹۳

"شاعری کے ذوق و فہم کا جو اعلیٰ مرتبہ ان (مولانا شبلی مرحوم) کے حصّہ میں
آیا تھا، اسکی تو نظیر ملنی دشوار ہے۔ ہندوستان میں فارسی شاعری غالبؔ پر
نہیں، ان پر ختم ہوئی کبھی مرتبہ مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ شاعری پر پوری طرح
متوجہ ہوتے تو ان کا وزن شعرِ فارسی میں غالبؔ سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔
پھر غالبؔ جو کچھ ہے تغزل و مدح کے محدود میدانوں میں ہے، لیکن مولانا
نے ... فکر و تخیل کے نئے نئے میدان پیدا کیے ......
غزل میں تو یقیناً مولانا کے ہاں غالبؔ سے کہیں زیادہ سرخوشی و کیفیت
ہے اور حقائق و ارادت کے لحاظ سے تو مقام ہی دوسرا ہے ....."

مولانا آزاد نے یہ رائے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام ایک خط[۱] میں ظاہر کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ شیروانی مرحوم نے آزاد کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ اگرچہ کھل کر نہیں کہا مگر جواب[۲] سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے خط میں شیخ علی حزیںؔ کی بے حد تعریف کی تھی۔ اور لکھا تھا کہ ہند کے معترضین شیخ حزیںؔ کے سامنے "زاغ و بلبل" کا حکم رکھتے ہیں۔ شیروانی مرحوم نے غالبؔ اور شبلیؔ کے موازنے کو پسِ پشت ڈال کر دو ہی جملوں میں بات صاف کر دی۔ کہتے ہیں۔

"شعر العجم میں علامہ (شبلی) مرحوم نے شیخ (علی حزیں) کو نہیں مانا،
میں نے ٹوکا۔ ایک بار سے زیادہ (میں تے) بنارس میں مزارِ شیخ (علی
حزیں) دیکھا ہے اور اسکو غزلِ فارسی کا مدفن محسوس کیا ہے ....."

شیخ علی حزیں کے مزار کو "غزلِ فارسی کا مدفن" کہنے کے معنی یہ ہوئے کہ شروانی کے نزدیک حزیںؔ کی غزل کے مقابلے میں غالبؔ اور شبلیؔ دونوں کی فارسی غزل ناقابلِ اعتنا تھی اور شعر العجم میں شیخ علی حزیںؔ کو نہ ماننے پر شروانی کا شبلی کو ٹوکنے کا مطلب یہ ہوا کہ انھیں شبلی کی فارسی شاعری کے متعلق آزاد کی رائے سے اتفاق نہ تھا۔

---

[۱] محررہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۰ء [۲] محررہ ۶ دسمبر ۱۹۴۰ء

(۷)

عمرِ گذشتہ کی کتاب ۔ مرزا ظفر الحسن ۔ حسامی بکڈپو حیدر آباد

ص ۱۹۸

فیض کہتے ہیں.... " یہ تو غالب نے خود ہی تسلیم کیا ہے کہ تصورِ جاناں کے لئے
فرصت کے رات دن ابھی شرط ہیں.... "
یہ بیان غالب کے اس شعر سے مستعار ہے جس کا پہلا مصرع عام طور پہ
اس طرح پڑھا جاتا ہے ۔ دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
حالانکہ صحیح شعر یوں ہے ؎

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں لیے ہوئے

"گویا کہ رات دن" دوسرے مصرع کا حصّہ ہے ۔
شعر کہنے کا یہ اسلوب اساتذہ کے نزدیک مستحسن نہیں تاہم غالب نے اسی کو حسن بنا
لیا ہے ۔ غالب کے اسی قبیل کے چند اور شعر سنیئے ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا !!

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا !

تلاشِ غالب ۔ نثار احمد فاروقی ۔ مئی ۱۹۶۹ء ص ۱۸۹

"غالب کے ہم عصروں میں ضلع بجنور کے ایک شاعر احمد حسن رسوا تھے ۔ جو فارسی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ ان کا فکر معمولی ہے اور فنی اعتبار سے بھی کلام بلند نہیں ۔ ان کا دیوانِ اردو طبع ہو چکا ہے اور فارسی کا دیوان بھی مطبع نولکشور نے شائع کیا تھا ۔ اس میں انھوں نے غالب کی متعدد زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے ۔ اور کئی جگہ غالب سے خوشہ چینی بلکہ اس سے بہتر کہنے کا دعویٰ بھی کیا ہے ..... اس دیوان کی ترتیب ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں ہوئی لیکن ورقِ اول پر لکھا ہے :

"دیوانِ رسوا ..... حسبِ فرمائش نواب علاؤالدین خان بہادر
فرمانروائے لوہارو ..... بہ ماہ جنوری ۱۸۹۹ء ..... مطابق ماہِ
رمضان ۱۳۱۶ھ"

فاروقی صاحب نے آخر میں رسوا کے دیوانِ فارسی سے ۸ ایسے اشعار دیئے ہیں جن میں "غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے" ، معلوم ہوتا ہے فاروقی صاحب کی نظر سے رسوا کا دیوانِ اردو نہیں گزرا ۔ میرے کتب خانے میں اسکی ایک جلد ہے ۔ کتاب کا نام دیوانِ رسوا ہے اور ورقِ اول کی آخری سطریں یہ ہیں :

"من تصنیف جناب مولانا مولوی احمد حسن صاحب متخلص بہ رسوا
خلف الصدیق جناب مولوی محمد حسن صاحب بیدار بجنوری ..... مطبع صادق
الانوار بہاولپور میں باہتمام حافظ عبد القدوس قدسی سپرنٹنڈنٹ کے چھپا ۔"

دراصل رسوا کے دیوانِ اردو دو تھے ۔ مگر اس دیوان میں دونوں کو ملا دیا گیا ہے ۔ "گویا شیر و شکر ایک جگہ ہو گئے ہیں" ۔ دیوان کے آخر میں گوری شنکر سہائے مجذوب (برادرِ خورد چنی لال مائل) الفت علی گویا ، شاگردِ رسوا ، حافظ عبد القدوس قدسی کی تقریظیں اور گوری شنکر سہائے مجذوب الفت علی گویا ، چنی لال مائل اور محمد جعفر ذکی شاگردِ رسوا کے قطعاتِ تاریخ درج ہیں ۔ تمام مادوں سے ۱۲۹۷ھ یا ۱۸۸۰ء مستخرج ہوتا ہے ۔ مگر طباعت کی تاریخ ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء ہے ۔ غزلوں کے کئی مقطعوں میں مومن اور ذوق کا نام بھی آتا ہے ۔ مگر غالب کا

نام زیادہ جگہ آیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسوا کو غالب سے خاص عقیدت تھی۔ اگرچہ تقریظوں میں رسوا کے احباب نے رسوا کو غالب اور دوسرے اساتذہ پر فوقیت دینے کی کوشش کی ہے مگر خود رسوا نے کہیں اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ ذوق پر مومن کو اور دونوں پر غالب کو ایک طرح سے ترجیح دینے کی کوشش صاف دکھائی دیتی ہے۔

شک تو نہیں کچھ ذوق کی استادی میں رسوا
پر حضرتِ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

رسوا ہم اسکا عہد جو پاتے تو دوڑ کر
لیتے ضرور مومنِ استاد کے قدم

ہے ریختہ میں مومن و غالب کا خوشہ چیں
رسوا یہ بات ہے ترے عقل و شعور کی

رسوا کہاں ہیں مومن و غالب کہاں ہیں ذوق
مدفوں مثالِ گنج یہ سب پاک ہو گئے

گلشنِ لہجۂ غالب میں عجب ہے رسوا
مثل بلبل کے ترا نغمہ سرا ہو جانا

زمانہ غالبِ آتش زباں کا یاد آتا ہے
دلِ پُر غم میں رسوا شعلہ زن ہے بار بار آتش

رسوا بقولِ حضرتِ غالب نہ ہو ملول
ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

لکھا جو اس غزل میں تو نے رسوا بس غنیمت ہے
زمینِ شعر ہے غالب سے استادِ سخنور کی

رسوا نے غالب کی اکثر غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ مگر غالب کی ٹکر کے تو کیا فنی لحاظ سے چست اور پختہ شعر بھی ڈھونڈے ہی سے ملتے ہیں۔ چھ غزلوں سے دو دو اشعار درج کئے جاتے ہیں :

پابہ زنجیر ہوا چاہتا ہوں ؛ یار کا حلقۂ در یاد آیا
ابرِ تر ہوگیا پانی پانی ؛ جب مرا دیدۂ تر یاد آیا

پہلے تو کبھی دیدہ سمندر نہ ہوا تھا ؛ یوں خلق کو طوفاں کا کبھی ڈر نہ ہوا تھا
تو آپ بھی حیرت زدہ ہوتا، یہ ہوئی خیر ؛ آئینہ ترے رُخ کے برابر نہ ہوا تھا

روح ہوگی مری مصروفِ بکا میرے بعد ؛ ہے کسے دردِ مرا میرے سوا میرے بعد
کس لئے ہو رہے ہیں خارِ بیاباں پیلے ؛ کیا نہ آوے گا کوئی آبلہ پا میرے بعد

جنت میں تو کچھ دل نہیں کھلنے کا ہمارا ؛ ظالم ترے کوچے سے چلے جائیں کہاں اور
اس بت کے سوا کچھ نہیں مانگا ہے خدا سے ؛ ہے میری طرف اس کا خیال اور گماں اور

ناخوش ہو یا کہ خوش نہیں انساں کا اختیار ؛ لکھا گیا ہے سب کا مقدر کہے بغیر
کامل ہے جذبِ دل تو یقیں ہے کہ ایک دن ؛ آئے گا میرے گھر وہ ستمگر کہے بغیر

جتنا عتاب اس کا ہے مجھ پر ہے سب روا ؛ مجھ سا جہاں میں ایک گنہگار بھی نہیں
تذلیلِ نفس کے لئے رسوا ہوں ورنہ میں ؛ زاہد نہیں تو رندِ قدح خوار بھی نہیں

---

(۹)

ذکرِ غالب - پانچواں ایڈیشن - مالک رام - فروری ۱۹۷۶ء

ص ۲۷

"(مرزا غالب کی بہن) چھوٹی خانم کی اولاد میں تین صاحبزادے اور
ایک صاحبزادی ہوئی۔ صاحبزادوں کے نام میرزا عاشور بیگ، میرزا جواد علی
بیگ..... میرزا عباس بیگ تھے ... ۔"

غالب کے بھانجوں یعنی بہن چھوٹی خانم کے صاحبزادوں کی یہ ترتیب بلحاظِ سن درست نہیں۔ میرزا جواد علی بیگ سب سے چھوٹے تھے۔ گویا میرزا عاشور بیگ، میرزا عباس بیگ اور میرزا جواد علی بیگ۔ آخرالذکر کا عرف میرزا مغل بیگ تھا۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے۔ متعلقاتِ غالب ص ۵۲)

(۱۰)

ذکرِ غالب - پانچواں ایڈیشن - مالک رام - فروری ۱۹۷۶ء

ص - ۹۳ "بلا مبالغہ اس پنشن کے، مقدمے پر اُن (غالب) کا ہزاروں روپیہ اٹھ گیا جس کا بڑا حصہ انہوں نے مہاجنوں سے سود پر لیا ہوگا... بدقسمتی سے مقدمے کا فیصلہ ان کے خلاف ہوگیا - اور ان کی باقی عمر اس قرض کو چکانے میں کٹ گئی .... ۱۸۳۵ء میں جب ان کے خلاف پانچ ہزار روپے کی ڈگری ہوئی تو اس زمانے میں بقول ان کے مجموعی طور پر چالیس پچاس ہزار کا قرض تھا۔"

(ص - ۹۰) "۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو غالب پھر جوئے کے الزام میں گرفتار ہو گئے۔"

(ص - ۹۳) "غالب کے لئے یہ بڑی سختی کے دن تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ پچھلے بیس پچیس برس سے

(مالی مشکلات کی وجہ سے) نہایت پریشانی کے عالم میں بسر کر رہے تھے۔" (ص۔ ۱۸۱) "(مرزا غالب کی بیوی امراؤ بیگم) نے یکم اگست ۱۸۶۹ء (یعنی غالب کی وفات کے ساڑھے پانچ مہینے بعد) نواب (رام پور) کی خدمت میں لکھا کہ آٹھ سو روپے مرزا (غالب) مرحوم کا قرض باقی ہے۔ اسکی ادائی کے لئے مدد فرمائی جائے۔۔۔۔"

اِن اقتباسات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۸۳۵ء میں جبکہ غالب کی عمر ۳۸ سال تھی وہ چالیس پچاس ہزار روپے (جسے آج کا کم از کم دس لاکھ روپیہ کہنا چاہئیے) کے قرض کے بھاری بوجھ تلے دبے ہوئے تھے اور ان کی مالی مشکلات ان کی جوئے کی علت میں اسیری کے بعد تک جبکہ انکی عمر ۵۰ برس کی تھی قائم رہی۔ پھر ہمیں یکایک یہ آگہی ہوتی ہے کہ انتقال کے وقت غالب صرف آٹھ سو روپے کے مقروض تھے۔ گویا غالب کو اپنی عمر کے آخری ۲۲ سالوں میں اس قدر آمدنی ہوئی کہ انھوں نے آٹھ سو روپے کے قرض کے علاوہ چالیس پچاس ہزار روپے کا تمام قرض معہ سود ادا کر دیا اور تقریباً سرخ رُو اس جہاں سے گئے۔ مگر

(ا) کیا یہ ممکن تھا؟

(ب) اگر تھا تو کیوں کر؟

معلوم ہوتا ہے کہ اصل قرض اور غالب کے بیان کردہ چالیس پچاس ہزار روپے کے مفروضہ قرض میں کوئی مناسبت نہ تھی محض زیادہ انعام و اکرام حاصل کرنے کی غرض سے ایسا لکھ دیا ہوگا۔

(۱۱)

ذکرِ غالب۔ فروری ۱۹۷۶ء۔ پانچواں ایڈیشن

(ص ۱۸۴) "یہ کتاب (لطائفِ غیبی) ۱۸۶۵ء میں سید سعادت علی کی 'محرق قاطع برہان' کے جواب میں لکھی گئی تھی۔۔۔۔۔۔"

ؔ غالب نے یہ اطلاع ایک فارسی خط بنام ناسخ میں دی ہے۔ دیکھئے متفرقاتِ غالب مطبوعہ ۱۹۴۷ء ص ۱۰۰ مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب۔

جناب مالک رام سے یہاں سہو ہوگیا ہے۔ 'لطائفِ غیبی' ۲ اکتوبر ۱۸۶۴ء کو چھپی تھی۔ خاتمے میں لکھا ہے " بتاریخ بست نہم ربیع الثانی ۱۲۸۱ھ ہجری طبع شد" اور یہ تاریخ ۲ اکتوبر ۱۸۶۴ء کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ میرے کتب خانے میں 'لطائفِ غیبی' کا ایک نسخہ ہے۔ جس کے آخری سادہ ورق پر یہ عبارت درج ہے جو غالباً تفتہ کے متعلقین میں سے کسی کی لکھی ہوئی ہے۔ تفتہ کی تو نہیں معلوم ہوتی۔

فرستادہ اوستاد، بدست منشی بہاری لال مشتاق بموصول
شد ۴ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء بخانہ ہرگوپال۔

گویا غالب نے بطورِ خاص یہ کتاب چھپنے کے ۲ مہینے ۲ دن بعد منشی بہاری لال مشتاق کی معرفت ہرگوپال (تفتہ) کو بھیجی۔

(ص ۲۰۵) " مدآری اور کلو داروغہ اور کلیان تینوں بہت لمبے عرصے تک ان کے پاس رہے۔ بلکہ کلو کا انتقال بھی میرزا کے بعد اسی گھر میں ہوا "

یہاں اسی گھر سے مراد وہ مکان ہے جس میں خود مرزا غالب کا انتقال ہوا لیکن کلو تو غالب کی وفات سے برسوں بعد مرا اور اسی گھر میں اس کی سکونت کا امکان سال دو سال سے زیادہ کا نہیں ہوسکتا کیونکہ غالب کی بیگم کا انتقال غالب کی وفات کے پورے سال بھر بعد ہوگیا تھا چنانچہ میں نے اس بارے میں جناب مالک رام کو تفصیلی خط لکھا۔ پھر جب میں دہلی گیا تو ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو از سرِ نو یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا۔ اور انھوں نے دیانت داری سے ذیل کی یادداشت تحریر فرمائی۔

" ۱۹۳۷ء کے جاڑوں کی بات ہے۔ شاید ۱۹۳۶ء کے اواخر کی ہو) کہ میں باقر علی خاں مرحوم (بیوہ) بگا بیگم صاحبہ کے پاس بیٹھا تھا۔ غالب سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ ہم نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر ورخشاں کے مکان (ضیا منزل) میں بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے فرمایا کہ کلّو (کالے خاں) غالب کا داروغہ ان کے بعد بھی زندہ رہا اور اس کا اسی مکان میں انتقال ہوا۔ اس وقت میں نے غور نہ کیا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ کلّو کا 'ضیا منزل' میں انتقال ہوا (نہ کہ غالب کے آخری سکونتی مکان میں۔ رضا) "

تفصیل کے لئے اسی کتاب میں میرا مضمون "غالب کا ملازمِ خاص۔ کلّو داروغہ" ملاحظہ فرمائیے۔

ارمغانِ بے بہا ـ ۱۲۸۹ھ از منشی دین دیال

(۱) غالب اور مومن کی موجودگی میں اور ذوق کی زندگی اور پھر وفات کے بعد بھی کافی عرصے تک ذوق کا مقام بطورِ شاعر بہت بلند رہا۔ گلدستۂ نازنیناں اور آثار الصنادید نے ذوق کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ "اب فی زمانہ خصوصاً دہلی میں کوئی اس (ذوق) کے مقابلے کا نہیں" اور کہ یہ بلندیٔ شعر "متقدمین سے متاخرین تک کسی اور فرد کو حاصل نہیں ہوئی"[۵] یہ ذوق کے معاصروں کے تبصرے ہیں اور اس زمانے کے مذاقِ سخن پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ایسا ہی ایک بے ساختہ تبصرہ "ارمغانِ بے بہا" کے ص ۲۴ پر ملتا ہے۔ یہ ۵۰ صفحے کا قدیم رسالہ منشی دین دیال میر منشی اجنٹی ریاست بھوپال کے فارسی خطوط اور رقعات کا مجموعہ ہے۔ منشی دین دیال میر منشی امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ اور فارسی کے اچھے انشاء پرداز تھے۔ اور سیہور (علاقۂ اجنٹی بھوپال) میں رہتے تھے۔ اگرچہ یہ خط ۱۲۸۹ھ میں شائع ہوئے مگر یہ لکھے ہوئے بہت پہلے کے تھے۔ یہ خط جس کا اقتباس یہاں درج ہو رہا ہے مولوی محمد نواز مدرس اوّل مدرسۂ سیہور کو لکھا گیا ہے۔ خط کے متن سے (جس کا اقتباس یہاں نہیں دیا جائے گا) معلوم ہوتا ہے کہ منشی جی مولوی محمد نواز سے اپنے مسودے اصلاح بھی کرایا کرتے تھے۔

قیاس چاہتا ہے کہ یہ خط ۱۲۷۹ھ یا ۱۲۸۰ھ میں لکھا گیا ہے۔ کیونکہ اسی زمانے میں دیوانِ ذوق مرتبہ ویرانؔ طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔

"دیوانِ ذوق کہ از عذوبت کلام چوں کاغذ قند شکر آمیز است و از نمکینی استعارات چوں طعنۂ حاسداں بر زخم منکراں نمک ریز، بخدمتِ خدّام مخدوم الانام می رسانم ....."

اب، انھیں منشی دین دیال کی تحریک پر منشی ہرزاین حقیر دہلوی نے اپنے بعض خطوط "خیالاتِ نادر" کے نام سے منشی نولکشور کے مطبع سے مارچ ۱۸۸۲ء مطابق ربیع الآخر ۱۲۹۹ھ کو شائع کرائے۔ مسودہ ۱۲۹۷ھ میں مکمل ہو چکا تھا۔ حقیر کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ ملاحظہ کیجیے ؎

چو پرداز ایں نثر را ختم کردم   بفضلِ خدائے توانا و قادر

حقیر از سینۂ نبی گفت بامن   کہ گو نام و سالش خیالاتِ نادر

۱۲۹۷ھ

حقیر[1] کا پہلا خط مولوی امین الدین امین کے نام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مولوی امین الدین امین ہرزاین کے استاد تھے۔ یہ امین الدین امین دہلوی جو پٹیالہ میں مدرس تھے وہی ہیں جنھوں نے غالب کی قاطع برہان کے جواب میں ایک کتاب قاطع القاطع لکھی تھی۔ قاطع القاطع، قاطع برہان کے معرکے کی سب سے پہلی کتاب تھی۔ یہ کتاب (صفحات ۲۶۸) ۱۲۸۳ھ میں مطبع مصطفائی سے چھپی تھی لیکن اس کی تاریخِ ترتیب فراغ سے ظاہر ہے کہ یہ ۱۲۸۱ھ میں مکمل ہو چکی تھی۔ محرق قاطع برہان میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اتفاق سے قاطع القاطع ہی ایسی کتاب ہے جس کا جواب غالب کی طرف سے نہیں دیا گیا تھا کیونکہ اس کی زبان فحش ہے۔ گدھے کے لات مارنے والا لطیفہ بھی اسی کتاب سے منسوب ہے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ اس کتاب کے مصنف پر غالب نے ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء کو ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ بھی دائر کر دیا اور جب بعد میں واپس لیا تو یہ بات غالب کے لئے اور بھی سبک سری کا باعث ہوئی۔ مقدمے کے گواہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ علم لوگوں میں مولوی امین الدین امین کا رسوخ مرزا غالب سے زیادہ تھا۔

اسی مجموعہ میں ایک خط غالب کے عزیز شاگرد لالہ بہاری لال (مشتاق) کے نام ہے اور تعجب ہے کہ ان سے حقیر نے قاطع القاطع کا ایک نسخہ مانگا ہے اور یہاں تک لکھ دیا ہے کہ

"شوقِ تماشائے گلزارِ ہمیشہ بہار قاطع القاطع ہم چناں دامنِ دل می کشد
یارب مطالعہ اش زود نصیبِ منتظراں فرماید و اشتیاق استفادہ ازاں مفید
الانام ہماں قدر در استیلات خدا لش جلد بر مشتاقان صادر نماید۔۔۔"

حالی نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ مولوی امین الدین کی طرف سے جو لوگ بطورِ گواہ غالب کے خلاف پیش ہوئے تھے ان کا مرزا سے ملنا جلنا تھا، کسی نے پوچھا۔ حضرت! انھوں نے آپ کے خلاف شہادت کیوں دی؟ مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا:

ہر آنکہ در نگری، جز بجنسِ مائل نیست
عیارِ بے کسیِ من شرافتِ نسبی مست

---

[1] "ہرزائن بن لالہ نتھ مل بن لالہ موتی رام بن لالا کرشن چند صاحب کایستھ ماتھر دہلوی" (ص ۵۲ خیالات نادر)

اس مجموعے کے دوسرے خطوط جو کسی قدر دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں یہ ہیں ۔

(۱) بخدمت شریف لالہ دین دیال صاحب میر منشی اجنٹی بھوپال در شکر ارسال نسخہ 'ارمغانِ بے بہا از نتائجِ افکار ایشاں

(۲) بخدمت شریف منشی دیو دیال صاحب در شکر عنایت نسخہ 'صفیرِ بلبل و صحت نامہ علوی و خارستان مجد الدین خوافی . . . .

(۳) در مبارکباد عید متضمن بعذر غیر حاضری خود بوالاخدمت مولوی امین الدین صاحب . . . .

(۴) بخدمت شریف منشی دین دیال صاحب در شکر عنایت نسخہ 'نادرہ کلیاتِ صہبائی . . . . . .

(۵) بخدمت منشی دین دیال صاحب در تعزیت اہلیہ ایشاں . . . . . .

(۶) بنام لالہ بہاری لال مشتاق در تعزیت صبیۂ ایشاں (یعنی دخترِ مشتاق) . . . . . .

(۷) بخدمت شریف منشی دین دیال صاحب در مبارکبادِ تولدِ نبیرۂ ایشاں . . . . . .

تمام کتاب پرانے ڈھنگ کی انشاء پردازی کی حامل ہے اس لیے زیادہ اہم نہیں ۔

(۱۳)

رسالہ عبد الواسع از میر عبد الواسع ہانسوی مطبع شعلۂ طور

کانپور ۲۹ ذلقعدہ ۱۲۸۰ ھ

ص۔۴ .... " فرق درمیان نفی بکلمۂ نا و بے . . . .

لفظ نامراد ... کہ در عرفِ عام شہرت وا دد، غلط محض است، بے مراد

. . . . باید گفت . . . . . . "

غالب نے عبد الواسع کے اس قاعدے کی اپنے خطوں میں بار بار مخالفت کی ہے ۔ صاحبِ عالم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

" وہ میاں صاحب ہانسی کے رہنے والے بہت چوڑے چکلے جناب عبد الواسع، فرماتے ہیں کہ بے مراد صحیح اور نامراد غلط ۔ ارے تیرا ستیاناس جائے ۔ بے مراد اور نامراد میں وہ فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے

نامراد وہ کہ جسکی کوئی مراد کوئی خواہش بر نہ آوے، بے مراد وہ کہ جس کا
صفحۂ ضمیر نقوش مدعا سے سادہ ہو۔۔۔۔۔"

غلام غوث بے خبر کے خط میں تحریر ہے۔

"۔۔۔۔ نامراد اور بے مراد کا ذکر مبنی اس پر ہے کہ عبدالواسع ہانسوی
نے بے مراد کو صحیح اور نامراد کو غلط لکھا ہے۔ میں لکھتا ہوں کہ ترکیبیں
دونوں صحیح لیکن بے مراد غنی کو کہتے ہیں اور نامراد محتاج کو"

غالب اس میں قطعی حق بجانب ہیں۔ عبدالواسع نے نامراد کو غلط قرار دے کر لغت اور محاورے کا پاس نہیں کیا۔

(۱۴)

نہر الفصاحت۔ مرزا قتیل۔ مطبع مصطفائی لکھنؤ

جمادی الاول ۱۲۵۸ھ ص ۲۸

"کدہ بمعنی خانہ باشد پانچ لفظ ملحق شدہ سوائے آں ممنوع نیست
بتکدہ، وغمکدہ، و آتشکدہ و میکدہ و گلشن کدہ۔۔۔۔۔

مرزا غالب کو قتیل کی فارسی دانی سے بے حد چڑ تھی اور وہ قتیل پر وار کرنے کے لئے ہر موقع تیار رہتے
تھے۔ چنانچہ نہر الفصاحت کے مندرجہ بالا قول کو سامنے رکھ کر غالب نے قتیل کو خوب خوب غلط گو کہا ہے
ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"۔۔۔ یہ الو کا پٹھا قتیل صفوتکدہ و شفقکدہ و نشترکدہ کو۔۔۔ غلط
کہتا ہے۔"

چودھری عبدالغفور سرور کے خط میں صاحب عالم کو لکھتے ہیں۔

"یہ شخص (قتیل) مدعی ہے کہ کدہ کا لفظ سوائے پانچ چار اسم
کے اور اسم کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا۔ بس آرزوکدہ اور دیوکدہ
اور نشترکدہ اور امثال اس کے جو ہزار جگہ اہلِ زبان کے کلام میں آیا ہے
وہ نادرست ہے۔۔۔"

ایک اور خط میں (بذریعہ چودھری عبدالغفور سرور) صاحب عالم کو طنزیہ لکھتے ہیں۔

"... وہ (قتیل) کہتا ہے کہ کدہ کے ساتھ سوائے پانچ سات لفظ
کے اور لفظ کو ترکیب نہ دو"

غالب نے اس (کدہ) لاحقے کے بیان کو قتیل کی زبان سے نہیں سنا تھا بلکہ قتیل کی تصنیف "نہر الفصاحت" میں لکھا ہوا پڑھا تھا مگر حیرت ہے کہ جہاں غالب نے متن کی عبارت کو بار بار دہرایا ہے وہاں قتیل کے حاشیے کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ جو نہر الفصاحت کے اسی صفحے پر درج ہے جس پر متن درج ہے قتیل نے حاشیے میں صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ یہ صرف اصولاً بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے ان پانچ اصولوں کے سوائے اساتذہ کے کلام میں جہاں کہیں اس قسم کے مرکبات آئے ہیں وہ انھیں اصولوں کی فروع ہیں۔ حاشیہ ملاحظہ فرمائیے اسے متن کے فوراً بعد پڑھنے سے بات واضح ہو جائے گی۔

"یعنی ایں ۵ اصول اند و سوائے ایں پنج آنچہ در کلام اساتذہ یافتہ شد
فروعِ ایں ہا باشد، حصر مقصودنیست و فروع در اصل داخل است چوں
حیرتکدہ و سنبلکدہ و حسرتکدہ و ماتمکدہ و سیلی کدہ و راحتکدہ و تغافلکدہ
جہنم کدہ و بہشت کدہ ہر دو در گلشن کدہ داخل است چراکہ گلشن جائے
گل معنی دارد و ماتم کدہ و عشرت کدہ تحت غمکدہ داخل اند، اوّل مرادف
معنی دوم بسبب ضد بودن نظیر بہ نظیر است ...."

(۱۵)

دیوانِ غالب مع شرح۔ جوش ملسیانی۔ بار پنجم۔
آتمارام اینڈ سنز دہلی ص ۲۷۹

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

میں نے کئی لوگوں کو یہ کہہ کر جوش صاحب کو مطعون کرتے دیکھا ہے کہ انھوں نے اپنی شرح میں اس شعر سے غالب کی مراد یہ لی ہے کہ "موت کا دن مقرر ہے اور وہ رات کو نہیں آئے گی پھر رات بھر

نیند نہ آنے کے کیا معنی ؟ لیکن جو کچھ شرح میں درج ہے وہ یہ ہے ۔

"ظاہری مطلب تو یہی ہے کہ موت اپنے وقت پر ضرور آئے گی پھر ہم اس کے آنے کا انتظار کیوں کریں ۔ مگر ادبی نکتہ اس شعر میں یہ ہے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے وہ دِن کے وقت آئے گی رات تو اس کے لئے مقرر ہی نہیں پھر رات بھر نیند کیوں نہیں آتی ..."

جب دسمبر ۱۹۷۴ء میں میں جوشؔ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے اس شعر کی شرح کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ۔ آپ نے فرمایا کہ "میں ظاہری مطلب تو پہلے ہی بیان کر چکا ہوں ۔ ادبی طور پر دِنؔ اور راتؔ کے تقابل سے استاد اور کیا معنی پیدا کر سکتا ہے ۔ وہ میں نے یہاں بیان کر دیئے ہیں ۔ شارح کو یہ حق ہی حاصل نہیں بلکہ اس کا فریضہ بھی ہے کہ وہ شعر کی تشریح کرتے وقت اس کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھے" آپ نے طبا طبائی کی شرح اٹھائی اور مجھ سے اس شعر کی تشریح پڑھنے کو کہا ۔ میں نے ذرا بلند آواز سے پڑھا

"شب ہجر میں موت اگر نہیں آتی تو وہ معذور ہے کہ اس کے آنے کا جو دن معیّن ہو چکا ہے اس میں تاخیر و تقدیم ممکن نہیں لیکن نیند کو کیا ہوا کہ رات رات بھر نہیں آتی ...."

سن کر بولے "شاعر زندگی سے بیزار ہو کر موت کی دعا مانگ رہا ہے یا موتؔ سے اس قدر خائف ہے کہ اس کے خیال سے اسے رات رات بھر نیند نہیں آتی ۔ اس ظاہری مطلب میں "شب ہجر" کی تخصیص کہاں سے آگئی ۔ ظاہر ہے کہ طبا طبائی نے اپنے شارح ہونے کے حق کو استعمال کیا ہے ۔ میرا ایک مطلع اس شعر کی ترجمانی کرتا ہے ۔

بے سود ارادہ مقتل کا بے کار دعا مر جانے کی
موت اپنے وقت پہ آئے گی بے وقت نہیں وہ آنے کی"

میرا خیال ہے کہ جوشؔ صاحب کو صرف یہ کہہ کر بات ختم کر دینی چاہئیے تھی کہ دن اور رات میں صنعتِ تضاد پائی جاتی ہے ۔ کیونکہ غالب کے اس شعر کی خوبیوں میں یقیناً ایک ادبی خوبی یہ بھی ہے ۔

---

(۱۶)

مکتوباتِ جوشؔ ملسیانی بنام رضاؔ۔ اگست ۱۹۷۶ء ص ۱۶۱

"آپ کا زرِ امداد ..... پہنچا۔ وہ بہت ممنون ہوئے ان کی طرف سے شکر

گزاری کا خط لکھ رہا ہوں۔ غالبؔ کا یہ شعر اس محل پر یاد آتا ہے ؎

مروت کردہ شب ہا بر تو سیرِ بام و در لازم

نمے باشد چراغے خانۂ بے دستگاہاں را "

یہ شعر ظہوری کا ہے۔ غالبؔ کا نہیں مگر غالبؔ کے خطوط میں درج ہے۔ میں یہ بات خطوطِ غالب (مہر ص ۴۹۴) کی سند پر لکھ رہا ہوں۔ ظہوؔری کے کلام میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ غالبؔ، چودھری عبدالغفور سرورؔ کو لکھتے ہیں۔

"میں جانتا ہوں مشتری اور عطارد نے مل کر ایک صورت پکڑی

تھی۔ اس کا اسم نورالدین اور تخلص ظہوری تھا۔ اللہ اللہ فرماتا ہے ؎

مروت کردہ شب ہا بر تو سیرِ بام و در لازم

نمے باشد چراغے خانہ ہائے بے نوایاں را "

یہاں جوشؔ صاحب سے سہو ہوا ہے نہ صرف یہ کہ اسے غالبؔ کا شعر کہہ دیا۔ بلکہ "خانہ ہائے بے نوایاں" کو بھی "خانۂ بے دستگاہاں" لکھ دیا۔ حافظہ عالموں کو بھی دھوکا دے جاتا ہے۔

(۱۷)

شرح دیوانِ غالبؔ۔ نظم طباطبائی۔ مطبوعہ مفید الاسلام حیدر آباد۔ ص ۴۷

غالبؔ کا ایک شعر ہے ؎ جگرِ تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا!!
جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس

نظم طباطبائی نے اس کی تشریح یوں کی ہے "یعنی میرا جگر تشنۂ آزار ہے اور آبلہ پائی، صحرانوردی سے اسے لطف ملتا ہے، اب بھی اسے تسلّی نہ ہوئی ایک ایک کانٹے کے پاس میرے تلوؤں سے لہو کی ندیاں بہہ گئیں۔ لیکن ایذا اٹھانے سے اس کا جی نہ بھرا۔ جگر تسلّی نہ ہوا، خلافِ محاورہ ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ تسلّی نہ ہوا، "تسلّی نہ شد" کا ترجمہ ہے[1]۔ یہ خلافِ محاورہ نہیں، قدما استعمال کرتے تھے۔ جیسے میر تقی میر ؎

نہ تسلّی ہوا دلِ بے تاب ۔ نہ تھما چشمِ تر سے خونِ ناب

(کلیاتِ میر۔ نولکشور۔ ۱۹۴۱ء ص ۹۰۲)

حق یہ ہے کہ غالب کا شعر میر کے شعر کا چربہ ہے۔

(۱۸)

گلزارِ سخن۔ جگناتھ فیض۔ مطبوعہ۔ تاریخ ختم کتاب ۱۹۰۸ء ص ۱۸۲

"ریاض خیرآبادی کا پہلا دیوان جو غالب کے رنگ میں تھا، تمام و کمال جنابِ اسیر (لکھنوی) کا اصلاحی تھا۔ چونکہ آپکی طبیعت کا وہ اصلی رنگ نہ تھا اور بقیدِ ردیف و قوافیِ غالب ترتیب دیوان کو، مرتبۂ غالب کے لحاظ سے آپ بدنما و نازیبا سمجھے۔ اس دیوان کو تلف فرمادیا۔ اسیر مرحوم کی ہدایت سے صاف و سادی زبان میں شعر فرمانے لگے۔۔۔۔۔"

غالب کے انتقال کے وقت ریاض کی عمر صرف ۱۶ سال تھی۔ اور قرائن سے ثابت ہے کہ غالب کے جواب میں ریاض اپنا دیوان غالب کی زندگی ہی میں کہہ چکے تھے۔ گلزارِ سخن کے مندرجہ بالا اقتباس سے تین باتیں سامنے آتی ہیں۔ (۱) ریاض کا پہلا دیوان غالب کے رنگ میں تھا۔

(۲) وہ تمام و کمال اسیر لکھنوی مرحوم کا "اصلاحی" تھا

(۳) اور اسے بعد میں بوجوہ ریاض نے تلف کر دیا۔

---

[1] خود غالب نے لکھا ہے ؎ مُردم ز فرطِ ذوق و تسلّی نمی شوم
یارب کجا برم لبِ خنجر ستانے را

خیابانِ غالب (نادم سیتاپوری مطبوعہ کراچی ص ۱۲۳) میں مندرجہ ذیل تفصیل سے بخوبی ظاہر ہے کہ ۱۔ قطعی درست ہے۔ یعنی ریاض نے ایک دیوان غالب کے دیوان کے جواب میں کہا تھا۔ ۳۔ یعنی یہ شہرت کہ وہ دیوان تلف کر دیا گیا (نذرِ آتش کر دینے کے حکم کی فوری تعمیل کی گئی) بھی درست ہے مگر صرف سنی سنائی کی حد تک۔ کیونکہ اس دیوان کا ریاض کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ دریافت ہو چکا ہے۔ اب رہا ۲۔ یعنی یہ کہ کیا وہ دیوان تمام و کمال اسیر لکھنوی کا اصلاحی تھا؟ نادم صاحب (جنھوں نے اس مخطوطے کو دریافت کیا) تحریر فرماتے ہیں۔

"..... بعض غزلیں اور ابیات ابتدائی حصہ میں شکستہ خط میں بھی ہیں اور پھر انھیں دوبارہ خوش خط بھی لکھا گیا ہے۔۔۔۔ جا بجا اشعار قلمزد کئے گئے ہیں۔ اور اصلاحیں بھی موجود ہیں۔ مگر یہ تمام اوراق بھی اس مخطوطے میں شامل ہیں۔ ان کا لفظ لفظ ریاض کا لکھا ہوا ہے ...."

نادم صاحب کے بیان سے اس بات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی کہ آیا دیوان اسیر مرحوم کا اصلاحی ہے کہ نہیں۔ اب نادم صاحب ہی کے مضمون سے خود ریاض مرحوم کا بیان ملاحظہ کیجئے۔

"میں نے ابتدائے سخن کے لئے 'دیوان غالب' کو پسند کیا تھا۔ 'دیوانِ غالب' کے اشعار پر بہ ترتیب قافیہ پیمائی کرتا، کلام جناب اسیر کو دکھاتا۔۔۔ مگر .... اکثر اس لئے پژمردہ واپس ہوتا کہ جناب اسیر بساط نشینان صحبت کو میرے اشعار 'بوجھیے' کہہ کر سناتے ......"

ریاض کا بیان "گلزارِ سخن" کے اس موقف کو کہ دیوان تمام و کمال اسیر کا اصلاحی تھا، تقویت پہنچاتا ہے۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ مولفِ تذکرۂ گلزارِ سخن منشی جگناتھ فیض آغائے سخن وسیم خیر آبادی (برادرِ ریاض خیر آبادی) کے شاگرد تھے اور ریاض کا ترجمہ ان کے لئے وسیم خیر آبادی ہی نے فراہم کیا ہوگا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جب یہ تذکرہ چھپا تھا اس وقت ریاض (بعمر ۵۶ سال) زندہ تھے۔

(۱۹)

گلزارِ سخن۔ جگناتھ فیض مطبوعہ۔ تاریخِ ختم کتاب ۱۹۰۸ء

اس تذکرہ نما کتاب کے مولف منشی جگناتھ پرشاد فیض ۱۸۵۹ء میں ناگپور کے مقام پر

پیدا ہوئے تھے۔ والد کا نام بخشی رام تھا۔ جو ہندی زبان کے ادیب تھے۔ تذکرے کی تالیف کے وقت فیض
نائب ہتمم بندوبست اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر کھنڈوہ میں متعین تھے۔ ہندی اور اردو
دونوں زبانوں میں نظم و نثر سے گہری دلچسپی تھی۔ وسیم خیر آبادی سے تلمذ تھا۔

گلزارِ سخن میں غالب اور شاگردانِ غالب کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ ذیل میں غالب
سے متعلق ضروری مواد دیا جاتا ہے۔ "آبِ حیات" کی پیروی کے علاوہ مولف کا کہنا ہے کہ غالب کے
"دیکھنے والوں میں اب بھی کچھ لوگ زندہ ہیں" جن کی زبانی حالات معلوم ہوئے ہیں۔

ص ۲۹۷۔ غالب تخلص۔ مخدوم اعظم، نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ
خاں بہادر نظام جنگ معروف بہ مرزا نوشہ خلف عبداللہ بیگ
خاں۔ آپ افراسیاب کی اولاد سے تھے۔ اکبر آباد میں پیدا ہوئے
مگر دلّی میں شادی ہوئی اس لئے وہیں سکونت اختیار کی۔ آپ کی
طبیعت بہت دشوار پسند تھی اور فارسی گوئی میں زیادہ توغّل تھا
آپ کے فارسی اشعار ظہوری اور مرزا عبدالقادر بیدل کے ہم پہلو ہوتے
ہیں اوائل میں اردو اشعار میں اسد تخلص فرماتے تھے۔ آپ کا
ابتدائی ریختہ بھی بالکل فارسی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے چنانچہ فرماتے ہیں

وہ جو کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

پھر خیالات کی بلندی اور دقتِ مضمون نے اس کو فہم عام سے بھی بالاتر بنا دیا۔ چنانچہ لوگوں کی شکایت
کے جواب میں آپ ایک جگہ کہتے ہیں۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

آخر میں دوستوں کی صلاح سے صاف گوئی و سادہ بیانی اختیار کر لی تھی اور ایک رباعی بھی اس مضمون
میں ہے، فرماتے ہیں ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل

حکیم آغا جان عیش جو ایک ظریف الطبع اور خوش مزاج شخص تھے، ایک روز انہوں نے آپ کے روبرو مشاعرے میں غزل طرحی میں آپ کی طرف اشارہ کر کے یہ قطعہ پڑھا ؂

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

بہر کیف آپ کا کلام بلاغت و متانت کا عمدہ نمونہ ہے اور پھر جو شعر صاف نکل گئے ہیں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ معانی کثیر کو الفاظِ قلیل میں آپ بڑے لف سے ادا فرماتے تھے۔ آپ کے دیکھنے والوں میں اب بھی کچھ لوگ زندہ ہیں۔ جن کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ بہت آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا صاحبِ دیوان اردو و فارسی گذرے ہم آپ کا کلام آپ کے دیوان سے انتخاب کر کے درج کرکے گلدستہ کرتے ہیں۔ (اس کے بعد غزل 'یہ نہ تھی ہماری قسمت ....'، کے گیارہ شعر درج ہیں۔ پھر لکھا ہے)

نواب زینت محل کے بیٹے شہزادہ جوان بخت بہادر کے زمانۂ عقد میں آپ نے یہ سہرا کہہ کر ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ مرحوم کی نذر گذرانا (پھر اس مشہور سہرے کے ۱۲ اشعر درج کئے ہیں) بعد ملاحظہ ظفر شاہ نے مقطع دیکھ کر خیال کیا کہ شیخ ابراہیم ذوقؔ کو جو میں نے اپنا استاد اور ملک الشعراء بنایا ہے یہ (مقطع) اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ سخن فہمی سے بعید ہے۔ اسی وقت شاہ مرحوم نے ذوقؔ مغفور کو سہرا دکھا کر مقطع کی جانب توجہ دلائی اور دوسرے سہرے کی فرمائش کی۔ چونکہ یہ (ذوقؔ) بھی استاد مسلم الثبوت تھے اسی وقت بکمال فکر سہرا کہا جس کا آج تک مثل و جواب نہیں ہوا۔ اور بادشاہ نے اربابِ نشاط کو دونوں سہرے عطا فرما کر شب کو مجلسِ تہنیت میں گانے کا حکم صادر فرمایا، چنانچہ حسب الحکم حضور بادشاہ اربابِ نشاط نے یکے بعد دیگرے دونوں سہرے گائے اور دوسرے روز دلی بھر میں مشہور ہو گئے۔ مرزا صاحب بھی سخن سنج و سخن فہم تھے۔ اور عہدہ مصاحبت پر ممتاز ہونے کی وجہ سے بادشاہ مغفور کے مزاج داں ہو چکے تھے۔ فوراً تاڑ گئے کہ مقطع مراباعثِ تکدرِ طبع شاہی ہوا، اسی وقت یہ قطعہ معذرت کہہ کر حضورِ بادشاہ میں پیش کیا جس کی خوبیٔ نظم نے بادشاہ

کے آئینۂ خاطر سے غبارِ کدورت کو دھودیا۔ (اس کے بعد قطعۂ معذرت 'منظور ہے گذارشِ احوال واقعی.....' ۱۲ شعر۔ غزل "جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے" ۱۱ شعر، غزل "حسنِ مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے" ۱۰ شعر، بطور انتخاب درج کیے ہیں۔)

ص ۳۴۷

"..... بلاغت میں جس پایہ کا (میر تقی میر) کا کلام ہے، اس پایہ تک سوائے مرزا نوشہ غالب کے کوئی نہ پہنچ سکا۔ غالب بھی اپنے نام کا تھا، جہاں کہیں میر نے جگہ دی ہے تو (غالب) بہت تیز روی سے اُس مقام پہ پہنچا ہے، جہاں آج تک کسی کے دماغ کا گزر نہیں ہوا۔ اگر میر نے کسی شعر میں بلاغت کا حصّہ لیا ہے تو مرزا نوشہ نے فصاحت کا۔ اگر (میر) کا کوئی شعر نزاکت اور غلو میں بالا ہے تو مرزا نوشہ کا مذاقِ سلیم مذاقِ اور رنگینیٔ بیان میں اعلےٰ ہے اور جہاں کہیں (میر) نے لاجواب اور بے مثل کہا ہے، وہاں مرزا نوشہ بھی ٹال گئے، اور چونکہ منصف مزاج تھے سمجھ گئے کہ اب اسکے مقابلے میں نہیں ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ہم اپنے قول کی تصدیق کے لئے (میر) کی اور غالب کی ایک ایک غزل ہم قافیہ وہم ردیف ذیل میں لکھتے ہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ جس قافیہ کو (میر) نے نہایت بلاغت سے فرمایا ہے اسی قافیے کو مرزا نوشہ غالب نے جگہ پاکر کہاں پہنچایا ہے اور جو قافیہ (میر) نے لاجواب فرمایا ہے وہاں غالب نے بھی دم نہیں مارا ہے....۔"

(غزل میر)

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا　　اب جس جگہ ہے داغ وہاں پہلے درد تھا

اک گردِ راہ تھی پئے محمل تمام راہ　　کس کا غبار تھا کہ یہ دنبالہ گرد تھا

دل کی شکستگی نے در آئی رکھا ہمیں　　واں چیں جبیں پہ آئی کہ یاں رنگ زرد تھا

مانندِ حرف صفحۂ ہستی سے اٹھ گیا　　دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا

تھا پشتہ ریگ بادیہ اک وقت کارواں　　یہ گردباد کوئی بیاباں نورد تھا

گزری مدام اسکی جوانانِ مست میں　　پیرِ مغاں بھی طرفہ کوئی پیرمرد تھا!

عاشق ہیں ہم تو میرؔ کے اس ضبطِ عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

(غزل غالبؔ)

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا — عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا
دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب — اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا — اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں — مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
احباب چارہ سازئ وحشت نہ کر سکے — زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حاشیے میں مولفِ 'گلزارِ سخن' نے میرؔ کے دو شعروں پہ غالبؔ کو مدِ نظر رکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جو لطف سے خالی نہیں ہے

'تھا پشتہ ریگ بادیہ اک وقت کارواں
یہ گرد باد کوئی بیاباں نورد تھا'

میرؔ کے اس شعر کے معنی یہ لکھتے ہیں :

ص ۳۴۸ "پشتہ ریگ بادیہ سے وہ تودے مراد ہیں جو صحرا و میدان میں گرد باد سے دب کر جابجا رہ جاتے ہیں، دیکھئے میرؔ نے اس سچے اور اصلی واقعہ کو، جس کو تغزل سے کوئی تعلق نہ تھا، کس خوبی سے مذاقِ عشق کے پیمانہ میں ڈھالا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گرد بادِ وحشی دشت گرد ہے، بلکہ اس عشق کے صحرا کا ہر صحرا ایک ذرہ اور اس کے دریا کا ہر دریا ایک قطرہ ہے...."

پھر غالبؔ کے اس شعر ' احباب چارہ سازئ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا '

کو میرؔ کے شعر کے مقابل رکھ کر کہتے ہیں ۔

".... مگر مرزا نوشہ نے اس قافیہ کو ایسا کہا ہے جسکی تعریف

نہیں ہو سکتی، جواہر حل کئے ہیں"

'عاشق ہیں ہم تو میر کے اس ضبطِ عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا'

سرد کا قافیہ غالب کی غزل میں نہیں ہے، اس پر جگناتھ فیض رقمطراز ہیں :

ص ۳۴۹ "حضرات ناظرین! دیکھئے سرد کا قافیہ میر کے مقطع میں ایسا ہے کہ اس کے مقابلے کام مرزا نوشہ سے ممکن نہ ہوا۔ اسی بات کا اندازہ کرکے اس نے قافیہ کو ہاتھ نہیں لگایا"

(۲۰)

مجموعۂ سخن۔ حصّہ اوّل۔ اکیسویں بار ماہ مئی ۱۸۹۴ء

نولکشور، لکھنؤ

اس کتاب کو پنڈت شیو نرائن ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع لکھنؤ، مولوی محمد حکیم الدین ہیڈ ماسٹر چوک اسکول لکھنؤ اور غلام حسنین قدر بلگرامی (شاگردِ غالب) نے کالن اے۔ او۔ براؤننگ ڈائرکٹر "سابق سررشتۂ تعلیم اودھ" کے ایمائ کے مطابق "اساتذۂ اردو ساکن لکھنؤ و دہلی کے کلام وفصاحت فرجام سے تالیف کیا" تھا۔ پیش نظر اکیسواں ایڈیشن ہے جو ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا تھا، فی الحال یہ معلوم نہیں کہ یہ کتاب پہلی بار کب شائع تھی مگر یہ یقینی ہے کہ پہلی اشاعت کے وقت واجد علی شاہ زندہ تھے اور بعد کے ایڈیشنوں میں حاشیے میں لکھ دیا گیا ہے کہ ان کا انتقال ۱۸۸۷ء میں ہوا۔ ۱۰۷ صفحے کی یہ کتاب "شعرائے متقدمین و سخنورانِ متاخرین" کے کلام پر مشتمل ہے اور آخر میں دقیق لفظوں کے معنی اور شعراء اور اشخاص کا تذکرہ ہے۔ غالب کا ترجمہ یہ ہے۔

ص ۹۴ "غالب تخلص نام ان کا اسداللہ خاں اور شاہ دہلی کی طرف سے نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ خطاب ہے۔ ۱۷۹۵ء میں خاص شہر دہلی میں متولد ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبداللہ بیگ خاں قوم اتراک سے ہیں۔ مرزا غالب کے دادا کسی بات پر اپنے باپ سے ناراض ہو کر ہند میں آئے اور لاہور میں معین الملک کے نوکر ہوئے۔ بعدہ دہلی میں آکر بادشاہی ملازمت اختیار کی۔ والد ماجد ان کے یہیں پیدا ہوئے۔ اور دہلی سے اُجڑ کر

اکبر آباد میں جا رہے۔ مرزا غالب کا سن پانچ برس کا تھا جب ان کے باپ نے قضا کی۔ تب ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں ان کے چچا نے ان کو پرورش کیا۔ وہ از جانب مرہٹہ اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ بعدہٗ ایک صاحب بہادر گورنر جنرل کی جانب سے چار سو سوار کے رسالہ دار ہو کر دو پرگنوں کے جاگیر دار ہوئے۔ آخر کو وہ جاگیر ۱۸۰۶ء میں ضبط ہو گئی اور اس کے عوض تنخواہ ملنے لگی جب تو مرزا غالب شاہ جہاں آباد میں آکر آباد ہوئے اور گوشہ نشینی اختیار کی۔ فارسی میں ایک آتش پرست کے شاگرد تھے اور زبانِ اردو میں فقط میر کے معتقد تھے۔ ۲ ذیقعدہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۶ء کو اس دارِ فانی سے کوچ فرمایا۔ اور دیوان قصائد فارسی و غزلیاتِ فارسی اور نثر فارسی میں تاریخ مہر نیمروز اور انشائے پنج آہنگ و قاطع برہان و تاریخ دستنبو اور اردو میں ایک دیوانِ غزلیات مختصر موجود ہے۔"

مجموعۂ سخن کے مؤلف اگر غالب کے اولین سوانح نگار نہیں تو کم از کم اولین سوانح نگاروں میں ایک ضرور ہیں۔ اندازہ ہے کہ یہ حال غالب کے پندرہ سولہ برس بعد لکھا گیا ہے۔ اور مؤلفوں میں غالب کے ایک شاگرد اور دوست (قدر بلگرامی) بھی شامل ہیں۔ مگر حیرت ہوتی ہے کہ اس وقت تک غالب کے حالاتِ زندگی (خصوصاً سنین) کے بارے میں خصوصی واقفیت بھی بہت نامکمل تھی۔ کتاب میں (۱) غالب کا سالِ ولادت ۱۷۹۵ء دیا گیا ہے۔ حالانکہ صحیح ۱۷۹۷ء (۲۷ دسمبر) ہے۔ (۲) وہ دلی میں نہیں بلکہ آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ (۳) ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کا انتقال ۱۸۰۶ء میں ہوا تھا۔ اس پر انگریزوں نے جاگیر واپس لے لی تھی۔ (۴) غالب ۱۸۰۶ء کے فوراً بعد دلی آکر آباد نہیں ہوئے تھے بلکہ ۱۸۱۲ء۔ ۱۸۱۳ء میں دلی میں سکونت اختیار کی تھی۔ (۵) تاریخ وفات کا تو کیا ہی کہنا، ۲ ذیقعدہ ۱۲۷۸ھ تو غالب کے انگریزی درباروں میں کرسی نشینی اور خلعت کے اعزاز کے دوبارہ اجرا کا زمانہ ہے۔ (۱۸۶۶ء سہو کتابت ہے ۱۸۶۲ء ہی ہوگا) مگر تاریخِ وفات تو بہر حال ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ (۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) ہی ہے۔

دیوانِ غالبؔ اردو نسخۂ عرشی مطبوعہ ۱۹۵۸ء

(ص ۲۹۹) مطلع

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

مقطع

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں (کل اشعار ۹)

ص ۳۸۹ پر عرشی صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ غزل بیاضِ علائی سے لی گئی ہے۔ رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۹ء میں بھی اس تمہید کے ساتھ چھپ چکی ہے۔

'میرزا مرحوم نے خواجہ میر درد کی مشہور غزل پر غزل لکھی تھی جو دیوانِ مطبوعہ میں نہیں۔ اب یہ غزل اردو میں اشاعت کے لئے بھیجتا ہوں جو ابھی ابھی سید زاہد حسین صاحب زاہدؔ نے مرحمت فرمائی ہے مفدر'

آگے چل کر عرشی صاحب لکھتے ہیں کہ زاہد صاحب نے اس میں دو شعر میرزا صاحب کی پرانی خارج کردہ غزلوں کے بھی داخل کر دیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ۹ اشعار جواب دیوان غالب اردو نسخۂ عرشی کے ص ۲۹۹ پر درج ہیں سب سے پہلے رسالہ سخن سنج کے اپریل ۱۹۱۷ء کے شمارے میں شائع ہوئے تھے۔ مرزا غالب کے کلام کے ساتھ مولانا شبلی کی ایک غیر مطبوعہ غزل بھی شائع ہوئی تھی جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے۔

یار کو رغبتِ اغیار نہ ہونے پائے
گلِ تر کو ہوسِ خار نہ ہونے پائے

آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں لیکن شبلیؔ!!
حالِ دل دیکھیے اظہار نہ ہونے پائے

مولانا شبلی کی غزل کے کل اشعار سات ہیں۔ ایڈیٹر سخن سنج نے "غزل جناب مرزا غالب مرحوم" اور "غزل

مولانا شبلیؔ مرحوم" سے پہلے یہ نوٹ دیا ہے جس سے غزل کے ماخذ کی نشاندہی ہوتی ہے۔

"غزلیات غیر مطبوعہ مرزا غالب دہلوی و علامہ شبلی رحمتہ اللہ علیہم ضیافتِ طبعِ ناظرین کے لئے ہدیتہً" پیش کی جاتی ہیں اور آخر میں ہم اپنے دوست منشی فصاحت حسین صاحب صابری و معظمی منشی حمید حسن صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے یہ غزلیات عنایت فرما کر ہم کو رہینِ منت فرمایا۔"

ایڈیٹر

(۲۲)

کلیاتِ غالبؔ (فارسی) دوسرا ایڈیشن مطبع نولکشور ۱۲۷۹ھ ۱۸۶۳ء

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

یہ شعر عام طور پر غالبؔ کا غزل سے بیزار ہونے کا ثبوت سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ شاعر اب غزل سرائی ترک کر کے نواب تجمل حسین خاں کی مدح سرائی شروع کرتا ہے۔ اگر غالب کو غزل گوئی ناپسند تھی تو انھوں نے آگے کے مدحیہ اشعار اسی غزل کی زمین میں کیوں کہے۔ وہ مثنوی کی کوئی زمین استعمال کر سکتے تھے۔

ایسا ہی ایک شعر مندرجہ بالا کلیات کے ص ۱۶۵ پر بھی ملتا ہے

غزل گر ملال آرد افسانہ گوے
کہن داستاں ہائے شاہانہ گوے

[یعنی اگر تجھے غزل سے ملال ہوتا ہے (اور وہ تجھے پسند نہیں) تو کوئی افسانہ کہہ یا پرانی شاہانہ داستانیں سنا] اسے بھی غزل کی مخالفت کی دلیل نہیں گردان سکتے۔ یہ شعر غالب کی مشہور مثنوی ابر گہر بار کے ساقی نامہ میں سے ہے۔

یہاں باقی اشعار پڑھنے سے مطلب صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے (اے لاابالی خرام) تجھے غزل اچھی نہیں لگتی یہی، تو کوئی افسانہ کہہ لے یا شاہانہ داستان ہائے کہن کہنے کچھ بھی کہہ لے میری تو صرف یہ خواہش ہے کہ تیری چال کا مستانہ پن اور بڑھے۔

حقیقت یہ کہ غالب کو غزل گوئی بےحد مرغوب تھی اور یہ رغبت انھیں غزل کی مخالفت پر کبھی آمادہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے غالب کے کلام سے غزل بیزاری کی کوئی علامت ڈھونڈنا سعی لاحاصل ہے۔

دیوانِ غالب مرتبہ حامد علی خاں: مجلسِ یادگارِ غالب لاہور ۱۹۶۹ء ص ۹

"اے[1] نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا"

حاشیے میں لکھا ہے "اس اے کی مثال غالب کے اس مصرع میں بھی کسی قدر ملتی ہے۔

ع اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے"

غالب نے اردو کلام میں دسیوں اشعار میں اے کا استعمال کیا ہے۔ اور ان میں سے بیشتر میں طریقِ استعمال ویسا ہی ہے جیسا کہ "اے نو آموزِ فنا۔۔۔ پسند" میں مگر مندرجہ بالا شعر کا اور ان دسیوں اشعار میں سے کسی شعر کا اسلوب "اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے" کا سا نہیں ہے مثلاً

اے دلِ ناعاقبت اندیش، ضبطِ شوق کر
اے خانماں خراب! نہ احساں اٹھائیے
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
اے تازہ وارداںِ بساطِ ہوائے دل
اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم
اے عندلیب چل کے چلے دن بہار کے
اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے
اے عندلیب! وقتِ وداعِ بہار ہے
اے عندلیب! یک کفِ خس بہرِ آشیاں
اے پری چہرہ! پیکِ تیز خرام
اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور!
اے شہنشاہِ آسمان اورنگ!

---

[1] 'اے نو آموزِ فنا۔۔۔' نسخۂ عرشی میں اے کی جگہ تھی ہے۔ خدا معلوم کہاں سے لیا ہے۔ دیوانِ غالب کے صرف تیسرے ایڈیشن میں اے ہے بقیہ بیشتر میں تھی ہے۔ نظامی ایڈیشن جو معتبر ترین ہے اس میں بھی ہے نو آموزِ فنا۔ ہے حامد علی خاں صاحب نے اس نکتہ پر روشنی ڈالی ہے۔
یاسین

البتہ ذیل کے چند مصرعے ایسے ہیں جن میں اے کا استعمال "اے نالہ نشانِ......" کے اے ایسا کہا جاسکتا ہے اگرچہ یہ مقابلہ دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہوگا ؎

اے شوقِ منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے

اے عافیت! کنارہ کر، اے انتظام! چل

اے شوق ایاں اجازتِ تسلیم و ہوش ہے

اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار! حیف

لیکن اگر بقول غالب (نقول یادگارِ غالب) "اے نالہ! نشانِ ...." میں اے جز کے معنی دیتا ہے تو اے کا یہ استعمال صرف اسی مصرع تک محدود ہے غالب نے کہیں اور اے بمعنی جز استعمال نہیں کیا "اے نوآموزِ فناہمتِ دشوار پسند" میں بھی نہیں ۔

مولانا حالی فرماتے ہیں (یادگارِ غالب پہلا ایڈیشن ص ۱۱۴) کہ "ایک شخص نے یہ معنی سن کر کہا کہ اگر وہ (غالب) اے کی جگہ جز کا لفظ رکھدیتے .... تو مطلب صاف ہو جاتا.... مگر مرزا معمولی اسلوبوں سے تا مقدور بچتے تھے اور شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے ...." مگر غالب نے یہ اسلوب ذیل کے شعروں میں روا نہیں رکھا اور یہاں جز کے لیے معمولی اسلوب ہی برتا ؎

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

اگر مرزا کو شارع عام پر چلنا منظور نہیں تھا، تو یہاں بھی جز کی جگہ اے کہہ سکتے تھے ۔

دیوانِ غالبؔ مرتبہ حامد علیخان مجلسِ یادگارِ غالبؔ لاہور

۱۹۶۹ء ص ۲۲۸

" دکھ جی کے پسند ہوگیا ہے غالبؔ
دل رک رک کر بند ہوگیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

حاشیے میں ہے " اس رباعی کے دوسرے مصرعے کے متعلق بڑا جھگڑا رہا ہے یہ بظاہر حضرت طباطبائی کے عروضی اعتراض سے شروع ہوا، جو غالباً غلط فہمی پر مبنی تھا

مختلف — اس کے بعد مختلف حضرات اس مصرع پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ اور انھوں نے رک رک کر' کے بجائے صرف 'رک کر' رکھ کر اس کی اصلاح کی کوشش بھی کی مگر یہ لحاظ نہ فرمایا کہ اس اصلاح سے رباعی کی جان بھی نکالی گئی ہے۔ 'دل رک کر بند ہوگیا' تو ایسا ہی مہمل ہے جیسا 'دل رک کر رک گیا' یا 'دل بند ہو کر بند ہوگیا'، غالبؔ نے 'دل رک رک کر' کہا تھا تو اس طرح ایک ایسے تدریجی عمل کی طرف بلیغ اشارہ کیا تھا۔ جو آخر کار حرکتِ قلب کے کاملاً بند ہو جانے کی تمہید بنا تھا اور جس کا ذکر کئے بغیر مصرع قطعاً بے کیف رہ جاتا ہے۔ عروض خواہ کچھ کہے 'رک کر' کو 'رک رک کر' کی جگہ نہیں دی جاسکتی "۔

مرتبِ دیوان کے حاشیے کی عبارت سے مندرجہ ذیل باتیں مستخرج ہوتی ہیں۔ جن کا باری باری اور تفصیل سے جائزہ لیا جائیگا۔

(ا) اس رباعی کے دوسرے مصرع میں ایک سبب بڑھ جانے کا اعتراض "غلط فہمی پر مبنی" ہے۔

(ب) بعض حضرات نے "رک رک کے بجائے صرف رک کر کہہ کر اسکی اصلاح کی کوشش بھی کی مگر۔۔ دل رک کر بند ہوگیا تو ایسا ہی مہمل ہے جیسے 'دل رک کر رک گیا'"۔

(ج) غالبؔ نے دل رک رک کر کہا تھا تو ایک ایسے تدریجی عمل کی طرف بلیغ اشارہ تھا جو آخرِ کار

حرکتِ قلب کے کاملاً بند ہو جانے کی تمہید بنا تھا۔۔۔'' عروض خواہ کچھ کہے رُک کر کو رُک رُک کر کی جگہ نہیں دی جاسکتی ۔''

آئیے اب ان امور پر غور کریں :

(ا) ''دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ'' میں یقیناً ایک سبب زائد ہے۔ اس اعتراض کا غلط فہمی پر مبنی ہونا کیا معنی؟ اگر یہ مصرع رباعی کے کسی وزن پر پورا اترتا ہے تو اسے آج تک پیش کیوں نہیں کیا گیا؟

(ب) اسلوبِ کلام پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے رُک کر نہیں بلکہ رُک رُک کری کہا ہوگا۔ ان کے یہ مصرعے دیکھیے :

؎ میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے

؎ تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

اگر انھوں نے رُک رُک کری کہا ہے تو ان سے یقیناً عروضی سہو ہوا ہے لیکن یہ بھی عین ممکن ہے کہ انہوں نے ''دل رُک رُک بند ہو گیا ہے۔ غالبؔ'' کہا ہو۔ ان کے کلام میں ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں انھوں نے کرؔ کو محذوف رکھا ہے۔ مثلاً

؎ ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ

؎ رک گیا دیکھ روانی میری

دونوں جگہ دیکھ بطورِ فعل امر نہیں بلکہ دیکھ کر کے معنوں میں آیا ہے۔ یہ زبان لاکھ پرانی سہی مگر غالبؔ نے اسے روا رکھا ہے اور وہ بھی منتخب متداول کلام میں۔ ان کے یہاں اور بھی متعدد مقامات ہیں جہاں پرانی زبان کے آثار موجود ہیں جیسے

؎ بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

؎ جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو

؎ ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

؎ یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی وغیرہ

(ج) دل کے رک رک کر بند ہو جانے سے غالب کی مراد کوئی ایسی ''تدریجی عمل نہیں ہے۔'' جو آخر کار حرکتِ قلب کے کاملاً بند ہو جانے کی'' کی خبر دیتا ہو۔ اگر اس مصرع سے یہ مطلب لیا جائے کہ ہوتے ہوتے دل کی حرکت کاملاً بند ہو گئی تو رباعی کے آخری دو مصرع

واللہ کہ شب کو نیند آئی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

قطعی بے کار ہو جاتے ہیں۔ موت کی ابدی نیند کے بعد رات کو نیند نہ آنے کی شکایت اور سونا سوگند ہو جانا بے ربط باتیں ہیں۔ مصرع کا مطلب صرف اتنا ہے کہ بار بار کے رنج والم سے دل گھٹ کے رہ گیا ہے" اس مصرع میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے موت واقع ہونے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ غالبؔ کے زمانے میں اس سے پہلے اس محاورے اور روزمرہ کے وہی معنی لیے جاتے تھے جو میں نے اوپر بیان کئے ہیں۔ مثلاً میر حسن ؎

تو رک رک کے دل کو نہ کر اپنے بند
نہ پہنچے کہیں تیرے جی کو گزند

اب اس رباعی کے بارے میں کچھ مزید عرض کرنا چاہتا ہوں۔ رسالہ اردو ادب (شمارہ ۳ سنہ ۱۹۶۵ء) میں سحر عشق آبادی مرحوم کا ایک مضمون "غالبؔ کی ایک رباعی" چھپا تھا۔ سحر لکھتے ہیں۔

"غالبؔ کی رباعی ہر شاعر کے لئے ایک پہیلی بنی ہوئی ہے۔ جو جس کے سمجھ میں آتا ہے لکھ دیتا ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ مرزا نوشہ اس پر نوٹ لگانا چاہتے تھے لیکن دوسرے مرزا (ہر گوپال سہائے صاحب بھٹناگر تفتہ سکندر آبادی) نے کہا کہ کچھ تو اوروں کو سمجھ لینے کے لئے بھی چھوڑ دیجئے۔ کیا اتنی بات بھی اہلِ نظر نہ سمجھ سکیں گے۔ مرزا نوشہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ آخر وہی ہوا جس کا مرزا نوشہ کو شبہ تھا..."

آگے کہتے ہیں۔

"اب میں (سحر عشق آبادی) کہتا ہوں کہ رباعی کا دوسرا مصرع (دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ) رباعی کے چوبیس اوزان میں ہے نہ جدید چھتیس اوزان میں"

پھر کہتے ہیں۔

"حامد علی خاں صاحب کے استفسار پر محترم نیاز فتح پوری نے اس مصرع کو ذرا بدل کر یہ وزن رکھا تھا ؎

ؔ نگار جون ۱۹۵۹ء ص ۳۶

دم رک رک کے بند ہوگیا ہے غالبؔ

مفعولن مفاعلن مفاعیلن فع

لیکن مفعولن مفاعلن یعنی مفعولن کے بعد مفاعلن رباعی کے ۳۶ اوزان میں کوئی وزن نہیں۔"

سحرؔ نے یہ صحیح لکھا ہے۔ نیازؔ نے غلط رکن لکھا۔ اسی مضمون میں سحرؔ نے لکھا ہے۔

"مرزا غالبؔ نے یہ مصرع 'دل رک رک کر بند ہوگیا ہے غالبؔ'، یعنی بتکرار رک ہی لکھا ہے۔ اس میں عروض کا جو نکتہ ہے وہ طباطبائی سے پوشیدہ نہ تھا۔ انہوں نے عمداً ظاہر نہ فرمایا۔ وہ چاہتے تو اب تک یہ مصرع معمّہ نہ بنا رہتا۔ آخر مجھے یہ معمّہ حل کرنا ہے اور ضرور کروں گا۔"

لیکن اس کے بعد سحرؔ صاحب دوسری باتوں میں الجھ گئے اور اس رباعی کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا گویا یہ معمّہ حل ہوتے ہوتے رہ گیا۔

میں نے ایک دفعہ ڈاکٹر گیان چند صاحب کو لکھا تھا کہ مجھے اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اس رباعی میں ایک سبب زیادہ ہے۔ اور یہ کہ یہ غالبؔ کا سہو ہے، لیکن میں نے کہیں سے سنا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اس امر کی کوئی تاویل پیش کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا، ملاحظہ کیجیے۔

"ایک دفعہ شمس الرحمٰن فاروقی سے اس رباعی کے بارے میں میری بات ہوئی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ محقق کے قول کے مطابق شاعر کو کسی بھی وزن میں ایک سبب خفیف بڑھانے کی اجازت ہے۔ انہوں نے اس زحاف کا کوئی نام بھی بتایا تھا۔ میں نے کہا کہ میرے علم میں محقق نے ایسا نہیں لکھا۔ ایک حرف کے اضافہ کا ذکر کیا ہے لیکن میرے سامنے فی الوقت نہیں آپ دیکھ لیجیے زرِ کامل عیار ترجمہ معیار الاشعار از محقق (ترجمہ اسیر)..... لیکن محقق خدا نہیں ہم اس کی بات کو کیوں مانیں۔ غالبؔ کا مصرع غیر موزوں ہے اگر یوں خوامخواہ سبب خفیف بڑھایا جائے تو سارا عروض ہی درہم برہم ہو جائیگا۔"

اسیرؔ مرحوم خود بھی بہت اچھے عروضی تھے۔ ان کے ترجمے کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ زرِ کامل عیار ترجمہ معیار الاشعار (نولکشور لکھنؤ۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء) ص ۲۱۲۔۲۱۳ پر بعض عربی اشعار درج کر کے محقق

نے لکھا ہے کہ اگر شعر کا ایک مصرع متقارب سالم ہیں (فعولن ۴ دفعہ) ہو تو اس کے دوسرے مصرع کا آخری رکن فعول یا فعل یا محض فع ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کے ص ۲۱۶ پر رودکی کی اس دھاندلی کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

بہاراست ہر روز در روزنم
منکر فراوان و معروف کم
یعنی مصرع اول فعولن فعولن فعولن فعل
اور مصرع ثانی فعلن فعولن فعولن فعل

کیا اس سے قیاس کیا جائے گا کہ اگر محقق فعولن کے مقابل فع یا فعلن لانے کی اجازت دیتا ہے تو اس نے کہیں خواہ مخواہ ایک سبب خفیف بڑھانے کو بھی لکھ دیا ہو گا؟

(۲۵)

مکتوباتِ آزاد مع ایک ضروری دیباچہ مولفہ سید جالب دہلوی مرغوب ایجنسی لاہور۔ بار دوّم

سید جالب دہلوی اپنے دیباچہ (ص ۱۰) میں فرماتے ہیں۔

"خاصکر کلو، کلیان .... مرزا صاحب (غالب) سے اس قدر مانوس تھے کہ کلو نے ان (غالب) کی وفات کے بعد پھر کسی کی نوکری ہی نہیں کی اور ساری عمر ان (غالب) کی یاد اور فاتحہ خوانی میں گذار دی۔ راقم الحروف نے کلو سے بار ہا مرزا صاحب مرحوم کے حالات سنے ہیں۔ مگر کبھی اس نے ٹھنڈا سانس لیئے اور سخت حیرت ظاہر کیے بغیر ان کا ذکر شروع نہیں کیا۔ (غالب کے) دیوان خانہ میں بیٹھنے والوں کی نسبت وہ کہا کرتا تھا کہ مرزا صاحب بعض اوقات دنوں نیچے نہ اترتے تھے۔ اور ان کی (وہ لوگ جو دیوان خانے میں آکر بے حد شور و غل مچاتے تھے) صورت نہ دیکھتے تھے۔ مگر وہ غل غپاڑہ گویا ان (غالب) کی غذائے روح تھا، جس کے بغیر انہیں (غالب کو) کل نہ پڑتی تھی۔ ان لوگوں (دیوان خانہ میں شور و غل مچانے والوں) سے اگر وہ کبھی کچھ کام لیتے تھے تو یہ لیتے تھے کہ

جب کوئی نیا مضمون باندھتے تھے اور اس کی مسرت کے کیف میں بے خود ہو جاتے
تھے تو نیچے تشریف لے آتے تھے اور وہ شعر لوگوں کو سناتے تھے اور داد لے کر پھر
الٹے پاؤں واپس چلے جاتے تھے۔ کبھی ایسا موقع ہوتا تھا دیوان خانہ میں چند ناخواندہ
شخص جمع ہیں جو شعر کا مطلب تو درکنار اسکی ترکیبِ لفظی کو بھی نہیں سمجھ سکتے تھے
مگر مرزا صاحب موصوف پر شوق کا وہ غلبہ ہوتا تھا کہ انہیں کو سناتے تھے۔ ایک
ایک لفظ کی تشریح کر کے بتاتے تھے۔ اور داد لیتے تھے۔ کلّو کا بیان ہے کہ کئی
مرتبہ ایسا بھی دیکھا کہ دیوان خانہ میں چڑیا بھی نہیں لیکن مرزا صاحب آئے اور دروازہ
میں کھڑے ہو کر آپ نے فرمایا "لو بھئی سنو، کیا مضمون ہاتھ آیا ہے"، اور پھر آپ
نے شعر پڑھا اور اس کی ضروری تشریح کی اور مطمئن ہو کر پھر کوٹھے پر چلے گئے۔ ملازم
چونکہ ان حالتوں سے واقف تھے اس لئے خاموش رہتے تھے۔ اور بعض اوقات کسی
معمولی آدمی کو چپکے سے دیوان خانے میں بھیج دیتے تھے۔ تاکہ مرزا صاحب کی تکلیف
رائیگاں نہ جائے اور وہ آزردہ نہ ہوں۔ حالانکہ انھیں مرزا نوشہ کی نازک دماغی
کا یہ حال تھا کہ بعض موقعوں پر جناب نواب ضیاء الدین خاں مرحوم نیّر درخشاں اور
نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ مبرور اور نواب علاء الدین خاں علائی مغفور جیسے روسا کے
بلند پایہ منتیں کرتے کرتے تھک جاتے تھے اور وہ ایک مصرع تک زبان پر نہ لاتے
تھے۔ اللہ اللہ سچ ہے کہ شاعر اپنے رنگ میں بادشاہ سے بڑھ کر ہوتا ہے۔۔۔"

یہ دیباچہ جالب دہلوی نے لاہور میں ۱۹ مارچ ۱۹۰۷ء کو تحریر فرمایا تھا۔ دیباچے کے شروع میں تحریر فرماتے ہیں
کہ "کم و بیش بائیس برس کا زمانہ گزرتا ہے کہ راقم سطور ھذا نے جس کی عمر اِن دنوں دس گیارہ سال
سے زیادہ نہ ہوگی، حضرت آزاد ۔۔۔ کو دیکھا"

اس بیان سے جالب دہلوی کا سالِ ولادت (۱۹۰۷ء میں سے پہلے ۲۲ سال اور پھر ۱۱ سال کم کرنے
سے ایک سال کی کمی بیشی کے ساتھ) ۱۸۷۴ء ٹھہرتا ہے۔ گویا جالب کی ولادت سے کم از کم پانچ سال پہلے غالب انتقال
کر چکے تھے۔

کلّو نے یہ باتیں ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ (جبکہ جالب دہلوی ۲۵ یا ۲۶ سال کے ہونگے) جالب دہلوی کو
بتائی ہونگی، گویا اسوقت غالب کو اس دنیا سے سدھارے ۳۰ سال ہو چکے تھے۔

غالب میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔ (مئی ۱۸۶۱ء) :

"..... غالب ..... ان دنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستانِ خیال کی آگئی ..... دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں، رات بھر شراب پیا کرتے ہیں ...."

قربان علی بیگ سالک کو لکھتے ہیں (۱۱ جولائی ۱۸۶۴ء):

"محمد مرزا (پسرِ سالک) پنج شنبہ اور جمعہ کو داستان کے وقت آجاتا ہے۔ رضوان (پسرِ سالک) ہر روز شب کو آتا ہے ....."

ان اقتباسات سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ غالب کو داستانیں پڑھنے سننے کا شوق تھا۔ اور ان کے دیوان خانے میں داستان سرائی کی محفلیں ہوتی تھیں مگر ان کے اوقات مقرر تھے یعنی پنج شنبہ اور جمعہ کے روز وقتِ معینہ پر۔ قیاس ہے کہ داستان سرائی کی محفل رات ہی کو ہوا کرتی ہوگی۔ کلو کا بقیہ بیان اَن پڑھ اور وفادار نوکروں کی زیٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ایسے ملازموں میں مبالغہ آرائی عمر کے ساتھ بڑھتی رہا کرتی ہے۔

(۲۶)

اردوئے معلّیٰ۔ اکمل المطابع دہلی۔ ۱۸۶۹ء۔ ص ۵۶

"میں بحرِ ہزج مسدس مخبون میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں ... 'بابو برج موہن' سوائے اس بحر (ہزج) کے یا بحرِ رمل کے اور بحر میں نہیں آسکتا وہ شعر میرا یہ ہے

برم چوں نام بابو برج موہن
چکد خونِ دلِ ریش از لبِ من "

غالب نے یہ خط تفتہ کو ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو لکھا تھا۔ اس کے جواب میں تفتہ نے غالباً غالب کے بیان کو چیلنج کرتے ہوئے ایک دوسرے وزن میں بابو برج موہن کو کھپا دیا۔ تاہم وہ وزن غالب کی بیان کردہ دونوں بحروں سے باہر نہیں تھا۔ چنانچہ غالب ۲۴ مئی ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں (اردوئے معلّیٰ ص ۱۰۶)

" وہ جو تم لکھتے ہو کہ

حرفِ بابو برج موہن مے زنم

اور اس کا دوسرا مصرع میں بھول گیا ہوں، مگر قافیہ میں مَن ہے، یہ شعر غالب کو برا معلوم ہوا ہوگا ..... جب تک کہ تم نے نہیں لکھا میرے خیال میں

بھی یہ بات نہ تھی۔ بہر حال بات وہی ہے جو میں اوپر لکھ آیا ہوں ......"

حقیقت یہ ہے کہ غالب کا شعر "بحر" ہزج مسدس محذوف میں ہے نہ کہ ہزج مسدس مخبون" میں۔ غالب نے مخبون غلط لکھا ہے۔ کیونکہ ہزج میں خبن نہیں آتا۔ خبن دوسرے حرف ساکن گرنے کا نام ہے۔ مفاعیلن میں دوسرا حرف متحرک ہے اس لئے خبن کی گنجائش نہیں۔

اب رہا بابو برج موہن کا بحرِ ہزج اور بحرِ رمل کے سوائے کسی اور بحر میں نہ آسکنے کا دعوا، تو یہ بھی غالب کی عروض سے کماحقہٗ واقفیت نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ بابو برج موہن ہزج اور رمل کے علاوہ بھی کئی بحروں میں آسکتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اردو میں مصرع میں نے لگائے ہیں

(۱) مضارع مثمن سالم

مفاعیلن فاع لاتن مفاعیلن فاع لاتن

مصائب سے رنج وغم سے، چھٹے بابو برج موہن

(۲) سریع مسدس مکسوف

مستفعلن مستفعلن مفعولن

دنیا سے بابو برج موہن اٹھے

(۳) خفیف مسدس سالم

فاعلاتن مستفع لن فاعلاتن

اب کہاں بابو برج موہن کا ثانی

(۴) رجز مثمن سالم

مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

افسوس بابو برج موہن آج دنیا سے گئے

اسی طرح ہے۔ ہیں

کسی کسی اور بحر میں نہ آسکنے کا دعوا، تو بھی غالب کی عروض سے

---

[1] خیال رہے کہ غالب اور تفتہ نے برج کو فاع کے وزن پر رکھا ہے۔ دراصل برج موہن میں برج کے تلفظ میں ب ساکن اور ر متحرک ہے اس لئے زیادہ بہتر یہ تھا کہ اردو میں برج کو مفا کے وزن پر لایا جائے۔ تاہم میں یہاں غالب اور تفتہ کے بقول ر ساکن مان کر ہی یہ بات کر رہا ہوں۔ بابو اور موہن کا وزن فعلن ہی ہے۔

مقالاتِ گارساں دتاسی (جلد اوّل) انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۴۳ء

(ص ۳۴۴) "لاہور کا اردو اخبار موسوم بہ پنجابی اپنے ایک شمارے (۱۹ مارچ ۱۸۷۳ء) میں ایک مضمون "ہندوستانی شاعری" میں بہ سبیل تذکرہ تہذیب الاخلاق کی تعریف کرتا ہے۔

"تین یا چار شعراء کے سوا مشاہیر شعراء نے فنِ قصیدہ نگاری کو ترقی دینے کے قابل نہیں گردانا۔ آتش نے ایک شعر بھی کسی کی مدح میں نہیں لکھا۔ سودا، ناسخ، جرات، مومن ذوق وغیرہ نے قصیدے لکھے تو ہیں لیکن صلے کی توقع کے بغیر۔ غالب کی حد تک یہ کہ اگر مجھے ان کے احباب اور ان کے شاگردوں کا خوف نہ ہوتا تو میں یہ ضرور کہتا کہ اس شاعر میں جہاں اور طرح کی اکملی خوبیاں تھیں، وہاں یہ عیب بھی تھا کہ جب کبھی وہ کسی نواب کسی خان، کسی رائے یا کسی مشہور ہندوستانی کا ذکر کرتا تو قصیدے کا رنگ اختیار کر لیتا"

یہ بات غالب کے انتقال کے چار سال بعد کی ہے۔ اس سے یہ تو معلوم ہو ہی جاتا ہے کہ لوگ غالب کے خوشامدانہ مزاج کو پسند نہیں کرتے تھے اگرچہ ایک عام ہندوستانی کے مزاج میں خوشامد کا عنصر عموماً پایا جاتا ہے۔ تاہم عام ہندوستانی مزاج کا یہ بھی ایک حصہ ہے کہ وہ ہر سربرآوردہ ہندوستانی کو اس لعنت سے پاک دیکھنے کا متمنّی ہے۔

یہی گارساں دتاسی (خطبات گارساں دتاسی۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۵ء ص ۸۱۲) اپنے خطبے میں جو ۶ دسمبر ۱۸۶۹ء کو دیا گیا تھا، لکھتے ہیں۔

"دوسرے مشہور شخص اسد اللہ خاں غالب ہیں۔ آپ اسد بھی تخلص کرتے تھے۔ آپ کا سرور سے دو ماہ قبل ۷۳ سال کی عمر میں انتقال ہوا موصوف اپنے زمانے کے بہترین انشاء پرداز اور شاعر تصور کیے جاتے ہیں۔ اہل ہند کا خیال ہے کہ موصوف کی تصانیف ابدالآباد تک زندہ اور باقی رہیں گی"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل ہند غالب کی تصانیف کو کتنا اونچا درجہ دیتے تھے۔ لہٰذا وہ غالب ایسے نامور ہندوستانی کے چہرے کو خوشامد کے عیب سے داغدار دیکھنا کس طرح گوارا کرتے۔

اب رہی دوسرے مشاہیر شعراء سودا، ناسخ، جرات، مومن، ذوق وغیرہ کے کسی صِلے کی توقع

کے بغیر قصیدہ لکھنے کی بات تو گارساں دتاسی کا یہ قول تمام تر درست نہیں کیونکہ سودا اور ذوق نے یقیناً صلہ پانے کی توقع میں قصیدے لکھے۔ ناسخ نے اردو میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ فارسی میں ضرور کہے ہیں اور صلہ پانے کی بات بھی مشہور ہے۔

(۲۸)

فغانِ بے خبر۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر۔ مطبوعہ ۱۸۹۱ء مطبع نامور پریس الہ آباد

(ا) (ص ۱۱۱ خط بنام مولوی عبدالرزاق شاکر)

"... میرٹھ پہنچ کر... جو موقع ملا۔ جی نے نہ مانا۔ دو روز کی رخصت لے کر دہلی آ گیا۔ احباب سے ملنا، شہر کا دیکھنا، مزارات کی زیارت کرنی، دو دن میں کیا کیا کرتا بہرحال اوروں سے ایک بار، حضرت غالب سے دو بار ملا۔ اور انھیں دیکھ کر رنج ہوا فی الواقع اب وہ پیر فانی ہو گئے ہیں۔ اور بڑی بے لطفی یہ ہے کہ سامع بالکل باطل ہے لکھ کر باتیں ہوتی ہیں۔ عرصہ دراز کے بعد ملاقات ہوئی جی چاہے کہ بہت سی باتیں کیجیے لکھنے میں بھلا کہاں تک لکھیے مگر حواس و ہوش بہت درست، شوخیِ طبیعت اور ظرافت کا وہی عالم بخلاف مولوی صدرالدین خاں (آزردہ) صاحب کے کہ ان کے حواس میں بھی فتور کلی ہے۔"

(ب) (ص ۱۲۸ بنام غالب)

"آپ کے ضعف کا حال جو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر بعضوں سے یہ سنا کہ اب آپ نے خدام سے فرمایا ہے کہ کوئی کاغذ ہو مجھے دکھایا ہی نہ کرو۔ اس سبب سے تحریر جراءت نہ کر سکا۔ دل پر جبر کر کے بیٹھ رہا۔ اب جو آپ کا عنایت نامہ آیا، نہیں کہہ سکتا کیسی خوشی ہوئی.... "

(ج) (ص ۱۳۰۔ خط بنام غالب)

"کل میں ایٹہ میں تھا۔ مرزا حاتم علی مہر جو اپنے بیٹے کے اس ضلع میں سررشتہ دار کلکٹری ہونے کے سبب سے بالفعل وہیں ہیں، میرے پاس بیٹھے تھے کہ ہرکارہ ڈاک کا آپ

کا خط لایا، میں نے پڑھا، انھوں نے سنا، دونوں نے لطف اٹھایا۔ پہلا مجموعہ (عودِ ہندی) اگر ایسا مہمل چھپا تو دوسرے (اردوئے معلّیٰ) کا چھپنا بہت مناسب ہوا مگر گستاخی معاف، یہ نام اردوئے معلّیٰ، نہایت بھونڈا رکھا گیا۔ لالہ صاحب یا بابو صاحب کی تجویز ہوگی۔ آپ نے اخلاق سے دخل نہ دیا ہوگا۔ آپ کی تصنیف اور ایسا بھدّا نام۔ لاحول ولا۔ اے قبلہ 'قندِ ہندی'، نام رکھا ہوتا یا پھر سے جو چھپا ہے 'قندِ مکرّر' فرمایا ہوتا۔ یہ دونوں نام کیسے شیریں ہیں......"

یہاں لالہ صاحب اور بابو صاحب سے مراد غالبؔ کے ہندو احباب اور شاگرد ہیں۔ لالہ شو نارائن آرام، بابو پیارے لال آشوب، لالہ ہرگوپال تفتہ، بابو جواہر سنگھ جوہر یا کوئی اور۔ اس زمانے میں ہندوؤں کی اُردو فارسی دانی کے بارے میں ایسی ہی رائے رکھی جاتی تھی۔ خود غالبؔ ایک جگہ کہتے ہیں۔ (بنام مجروحؔ) "میاں یہ اہلِ دہلی کی زبان ہے۔ ارے اب اہلِ دہلی یا ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں... . ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے"، حالیؔ فرہنگِ آصفیہ پر ریویو کرتے ہوئے دس قدم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اردو ڈکشنری لکھنے کے لئے ان کے نزدیک دو نہایت ضروری شرطیں ہیں۔ اوّل یہ کہ اس کا لکھنے والا دلّی کا باشندہ ہو اور

"دوسری شرط یہ کہ ڈکشنری لکھنے والا شریف مسلمان ہو کیونکہ خود دہلی میں بھی فصیح اردو صرف مسلمانوں ہی کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی سوشل حالت اردوئے معلّیٰ کو ان کی مادری زبان نہیں ہونے دیتی[1]...."

حالیؔ کی آواز اصل میں انشاءؔ کے موقف کی بازگشت ہے۔ وہ دریائے لطافت میں کہہ چکے ہیں کہ دہلی میں ہر کسی کو فصاحت نصیب نہیں ہے۔ اس کے لئے اصل شرط یہ ہے کہ وہ نجیب ہو، یعنی اس کے ماں باپ دلّی کے ہوں (ظاہر ہے کہ ایسا شخص ہندو نہیں ہو سکتا کیونکہ ہندوؤں کے بارے میں انھوں نے اپنا نظریہ الگ سے پیش کیا ہے اور کہا ہے) کہ صاحبِ تمیز لوگ جانتے ہیں کہ چال ڈھال، کھانا پینا، اور گفتگو کا سلیقہ ہندوؤں نے مسلمانوں ہی سے سیکھا ہے۔ اس لئے کسی مقام پر بھی ان کے قول فعل کو معتبر نہیں جاننا چاہئے۔

اردوئے معلّیٰ کی پہلی جلد غالبؔ کی دیکھ ریکھ میں مکمل ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا نام (اردوئے معلّیٰ) بھی غالبؔ ہی کا تجویز کردہ ہے لیکن اگر یہ کسی "لالہ صاحب یا بابو صاحب" نے دیا ہے تو ہمیں اِن 'لالہ صاحب یا

---

[1] حالیؔ نے مقدمۂ شعر و شاعری (جامع ایڈیشن ۱۹۶۹ء ص ۳۲) میں بھی لکھا ہے کہ "...عربی کے ساتھ فارسی، ترکی، پشتو اور اردو ..... خالص مسلمانوں کی زبانیں ہیں ....."

بابو صاحب کے ذوقِ صحیحہ کی داد دینی چاہیے۔ اردوئے معلّٰی کے خطوط کی اشاعت کا مقصد ہی یہ تھا کہ پہلے حصے کے صاف صاف عبارت کے خطوں سے مدرسے کے طلبا فائدہ اٹھائیں اور دوسرے حصے کی نثر سے "سخنورانِ معنی یاب" لطف اندوز ہوں۔ ایسے مجموعے کا نام اردوئے معلّٰی سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ بے خبر نے اپنے خطوط کے مجموعوں کا نام "فغانِ بے خبر" اور "خونابۂ جگر" رکھا ہے تو مذاقِ سلیم سر پیٹ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پھر بے خبر کا یہ کہنا بھی قطعی نادرست ہے کہ اردوئے معلّٰی عودِ ہندی کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ ان دونوں مجموعوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ عودِ ہندی میں کُل خط ۱۶۶ ہیں جبکہ اردوئے معلّٰی میں ۴۸۰ خط ہیں۔ عودِ ہندی میں ۲۲ مکتوب الیہ ہیں اور اردوئے معلّٰی میں ۴۹۔ اس کے علاوہ دونوں کی نوعیت اور نصب العین میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔

(ے) بے خبر نے فغانِ بے خبر کے خطوں میں کہیں کہیں غالب کے شعر بھی لکھے ہیں۔

ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب — مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

عشق نے غالب نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

خزاں کہتے ہیں کس کو فصلِ گل کیا کوئی موسم ہو — وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

ایک شعر میں تحریف کی ہے ؎

اپنے دل پر ہی جب نہ ہو قابو — کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

غالب کا مصرع اوّل یہ ہے ؎ جب توقع ہی اٹھ گئی غالب

اس وقت کے اعتبار سے اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے غالب، بے خبر کی عزت بلکہ چاپلوسی کرنے پر مجبور تھے، ورنہ علمی ادبی حیثیت سے بے خبر بمقابلۂ غالب نہایت پست قد تھے۔

(۲۹)

دیوانِ غالب پہلا ایڈیشن۔ چھاپہ خانہ سید محمد خاں بہادر

اکتوبر ۱۸۴۱ء ص ۴۰

(۱) میرے کتب خانے میں ایک قلمی بیاض ہے۔ (اس پر ایک مبسوط مضمون اسی کتاب میں شامل ہے) جو رفعتؔ شروانی بھوپالی شاگردِ غالبؔ کی ہے۔ اس کے ص ۲ پر رفعتؔ کا ایک شعر ہے ؎

عمر با یاران ہم مشرب بسر بردن خوش است
خلرِ شیراز با ایرانیاں خوردن خوش است

حاشیے میں رفعتؔ کہتے ہیں۔

"خلر نام دہ است قریب شیراز کہ درآنجا اقسام انگور باِفراط تمام می شود
وشراب کشیدہ ازآنجا بدیگر بلاد می برند باین رو شراب راخلّر (می گویند)"

اس کی تصدیق کے لیے میں بہارِ عجم کی ورق گردانی کر رہا تھا، اس میں "خُلّر" لفظ تو نہیں ملا مگر ایک عجیب ترکیب پر نظر پڑی اور یہ تھی 'جگر تشنہ' بمعنی

کنایہ از بسیار مشتاق کذا فی الملحقات

اور فوراً غالبؔ کا مطلع یاد آیا۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

اب ساری شرحیں ایک طرف دھری رہ گئیں اور اس شعر کے سیدھے سادھے معنی پیدا ہو گئے۔ یعنی دل فریاد کا بے حد مشتاق ہوا" وہ جو 'دل جگر' نے ایک پھانس گاڑ رکھی تھی" دم زدن میں نکل گئی۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ تشنہ بمعنی آرزومند یا مشتاق استعمال ہوتا ہے جیسے میرؔ کا شعر ؎

خضر، تشنہ اس کے ہے دیدار کا
مسیحا شہید اس کے بیمار کا

لیکن غالبؔ نے "جگر تشنہ" کی نہایت قلیل الاستعمال ترکیب استعمال کی جس سے مراد "بہت زیادہ مشتاق" کے سوا کچھ اور نہیں۔ شعر غالبؔ کے ابتدائی کلام میں سے ہے۔ گویا غالبؔ نے اسے متداول کلام کے لئے بطورِ خاص منتخب کیا ہے۔

مئی ۱۹۸۱ء میں مکرمی ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب "ذکر و فکر" کا نسخہ ارسال فرمایا۔ اس کے ص ۵۴ سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب "جگر تشنہ" کی ترکیب کے درست معنی (بہت مشتاق) سے واقف تھے۔ مزید دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انھیں یہ معنی ۱۹۶۸ء سے معلوم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے غالبؔ کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے غیر متداول کلام کی شرح کی ہے۔ تاہم اس گتھی کے سلجھانے

میں اولیت یوسف سلیم چشتی کو حاصل ہے۔ (شرح دیوانِ غالب۔ مطبوعہ لاہور جنوری ۱۹۵۹ء بار اول) مولانا حسرت موہانی نے بھی اپنی شرح میں اس کے معنی قریب قریب ٹھیک لکھے ہیں مگر انھوں نے محض قیاس سے کام لیا معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں

"جگر تشنہ' بمعنی 'تشنہ جگر' یعنی آرزو مند۔ مطلب یہ ہے کہ دیدہ تر کی یاد
نے پھر دل کو فریاد کا آرزو مند بنا دیا۔"

(دیوانِ غالب (اردو) مع شرح دیوانِ غالب۔ دیباچہ طبع سوم ۱۶ اگست ۱۹۱۱ء ص ۲۶)

لیکن جگر تشنہ کے معنی "بہت زیادہ آرزو مند" کے ہیں صرف آرزو مند کے نہیں۔ اور غالب نے اسے انھیں معنوں میں استعمال ہے۔ حسرت نے جگر تشنہ کو 'تشنہ جگر' کے برابر رکھ کر 'آرزو مند' کے معنی نکالے ہیں جو صرف 'تشنہ' کے معنی ہیں۔ مگر لغت سے معلوم ہوتا ہے کہ 'تشنہ جگر' 'تشنہ دل' اور 'تشنہ' ہم معنی ہیں یعنی مشتاق آرزو مند۔ مگر 'جگر تشنہ' کے معنی ہیں بسیار مشتاق بہت زیادہ آرزو مند ۔ (جگر تشنہ، کلمۂ مبالغہ ہے یعنی بغایت تشنہ ۔ یوسف سلیم چشتی)

میں نے فرہنگِ فارسی از ڈاکٹر محمد معین ، فرہنگِ نفیسی، لغت نامہ موئلفہ علی اکبر دہخدا وغیرہ سب دیکھے ہیں مگر سب نے "جگر تشنہ" کے معنی کم و بیش فرہنگ آنند راج کے حوالے سے لکھے ہیں۔ اور فرہنگ آنند راج کے مولف نے اسے "بہار عجم" سے لیا ہے۔ ٹیک چند بہار نے کوئی شعر بطورِ سند نہیں دیا ہے۔ حالانکہ وہ عام طور پر ایسا کرتا ہے۔ لہٰذا کسی فرہنگ نے بھی اس ترکیب کے لئے سند فراہم نہیں کی۔ اس سے بآسانی یہ مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ ترکیب نہایت قلیل الاستعمال رہی ہوگی مگر غالب کو یہ بہت بھاتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے اسے اردو اشعار میں دو جگہ استعمال کیا بلکہ فارسی میں بھی کم از کم تین اشعار میں استعمال کیا ہے اور ایک جگہ جگر تشنگی (بمعنی بہت زیادہ مشتاق) بھی باندھا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

زلالِ لطف تو سیرابیِ ہوسناکاں
یکے ببیں کہ جگر تشنۂ جفائے تو کیست

بر تشنہ لب بادیہ سوز دلش از مہر
اندوہ جگر تشنۂ دیدار نداند

بیایند و داغ بیاے روند
جگر تشنۂ مرحباے روند

"جگر تشنگی" بھی دیکھ لیجئے ۔

یا پیش ازیں بلاے جگر تشنگی نہ بود
یا چوں من التفات بہ جیحوں نکردہ کس

"جگر تشنہ" بمعنی ..... بسیار مشتاق ... بمفاعیل (یا مفاعیلن) کے وزن پر ہے۔ دوسری تمام تراکیب کا انحصار دونوں لفظوں کے لغوی معنی پر رہے گا۔ غالب نے یہ استعمال بھی کئی اشعار میں کیا ہے چند فارسی شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں ۔

ز شوری نمک پرسشِ نہانی تست
اگر مرا جگرِ تشنہ' عتابے ہست

مگر دہم جگرِ تشنہ را دے بے داغ
نشاں دہید بر آتش اگر سرابے ہست

ستم کہ با جگرِ تشنہ می نوردم راہ
بوادی کہ خضر کوزہ و عصا انداخت

از جگرِ تشنہ بدریا سرود
وز تنِ بے جاں بمسیحا درود

(۲) اسی غزل کا مقطع ہے (دیوانِ غالب پہلا ایڈیشن ص ۱۴) ؎

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

یہ کچھ ایسا دقیق شعر نہیں ہے لیکن لڑکپن سے بچپن مراد لینا درست نہیں ہو سکتا کیونکہ عمر کے اس ابتدائی دور میں یہ سوجھ بوجھ کہاں سے آ سکتی ہے جس کا یہ شعر تقاضا کرتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ یہاں لڑکپن کے معنی نادانی، ناسمجھی کے سوا کچھ نہیں، یعنی یہ میری نادانی تھی جو میں نے مجنوں پر پتھر اٹھایا لیکن مجھے فوراً خیال آ گیا کہ تو بھی تو عاشق مزاج ہے کوئی مجنوں سمجھ کر تیرے ساتھ بھی وہی سلوک کریگا جو تو مجنوں سے کرنے والا ہے یعنی تیرا سر پھوڑے گا۔

ل غالب کا دوسرا اردو شعر یہ ہے ؎ ہر کفِ خاک، جگر تشنہ' صد رنگ ظہور
غنچے کے مے کدے میں مستِ تامّل ہے بہار

ماہنامہ نقاد۔ آگرہ جون ۱۹۱۴ء ایڈیٹر شاہ دلگیر

"کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام
فرمانروائے کشورِ پنجاب کو سلام"

یہ قصیدہ جو غالب کے متداول کلام میں شامل نہیں ہے۔ سب سے پہلے ۱۷ جون ۱۹۱۴ء کے الہلال میں مولانا ابوالکلام آزاد نے شائع کیا تھا۔ وہاں سے شاہ دلگیر ایڈیٹر نقاد آگرہ نے اسی ماہ کے شمارے میں اسے شائع کیا۔ پھر جولائی ۱۹۱۴ء کے زمانہ کانپور میں اسے نقل کیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ماخذ دیوانِ غالب اردو کا وہ قلمی نسخہ تھا جو نواب سعید الدین احمد خاں طالب کی ملکیت تھا اور چند دنوں کے لئے مولانا کے پاس رہا تھا کئی برس بعد جب دیوانِ غالب۔ طاہر ایڈیشن شائع ہوا تو یہ قصیدہ اس میں بھی درج تھا مگر اس کا ماخذ مولانا ابوالکلام آزاد والا ماخذ نہ تھا بلکہ بقول طاہر ان کے نانا حسین مرزا کے ہاتھ کا لکھا ہوا "دیوانِ غالب" تھا جسے "مرزا (غالب) نے پڑھ کر دستخط اور مہر سے مزین کر کے بطور یادگار (حسین مرزا) کو واپس کر دیا تھا۔

اس طرح بہ ظاہر اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ یہ قصیدہ غالب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ تاہم نقاد آگرہ جون ۱۹۱۴ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مضمون کے بعد ایڈیٹر (شاہ دلگیر) کا ایک مبسوط نوٹ شائع ہوا ہے جس میں ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ "یہ قصیدہ از روئے کلام مرزا نوشہ کا ہو ہی نہیں سکتا"۔ فی الحال میرے علم میں نہیں کہ کہیں اس نوٹ کا جواب دیا گیا ہو اگرچہ حاشیئے میں دلگیر نے امید ظاہر کی ہے کہ نواب (سعید الدین احمد رئیس لوہارو) اس امر پر ضرور روشنی ڈالیں گے کہ ان کو یہ قصیدہ کہاں سے اور کیونکر ملا تھا تاکہ معاملہ صاف ہو جائے۔ پھر حالی، شبلی، شرر، حیدر (نظم طباطبائی) اکبر اور ریاض خیر آبادی سے التماس کیا ہے کہ وہ اس قصیدے کی نسبت اپنی اپنی گرامی رائے سے مطلع کریں۔ تاکہ بطور قولِ فیصل ان کی آراء کو نقاد میں شائع کیا جائے۔

نوٹ کے صرف ضروری اقتباس ہی درج کیے جاتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزاد۔۔۔۔ اس قصیدے سے متعلق اپنے مضمون (الہلال ۱۷ جون ۱۹۱۴ء) میں مفصل بحث کر چکے ہیں جس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ یہ قصیدہ

۱؎ قوسین کی تمام عبارتیں میری طرف سے اضافہ کی گئی ہیں۔ رضا

کب اور کس غرض سے لکھا گیا۔ لیکن سب سے زیادہ اہم بات جو فاضل ایڈیٹر کی نظر نقد سے رہ گئی وہ وہی ہے جس کی نسبت نہایت رواداری میں انہوں نے یہ جملہ لکھ کر ٹال دیا ہے۔ "امید کہ مرزا (غالب) مرحوم کے ان عقیدت مندان کمال کے لئے جن کی تعداد اب ملک میں روز افزوں ہو رہی ہے یہ غیر مطبوعہ قصیدہ بہت دلچسپ ہوگا، گو شاعری کے اعتبار سے چنداں اہم نہ ہو۔

..... ہم جانتے ہیں کہ جب کسی کے احترام ذاتی اور وقعتِ کلام کی حالت یہ (یعنی حد سے بڑھی ہوئی خوش اعتقادی کی) ہو جاتی ہے تو ایک گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو صرف اپنی شخصیت میں اضافہ، تعزز کے لئے لغو و بے سر و پا کوششیں ذات و کلام سے نسبت پیدا کرنے کی کرنے لگتا ہے چنانچہ آج بھی بہت سے نفوس ایسے موجود ہیں جو صرف دوسروں کے مرعوب کرنے کے لئے اپنے تئیں غالب کا شاگرد بتلاتے ہیں.... "

.... آج ایڈیٹر صاحب الہلال، نواب طالب دہلوی کی روایت سے غالب کا یہ غیر مطبوعہ قصیدہ شائع کرتے ہیں، جس کو دیکھ کر بے اختیار ہماری نگاہوں کے سامنے صولت فاروقی کا وہ مدبرانہ طرزِ عمل آ جاتا ہے جب احادیث رسول کی روایت کرنے والوں کی زبانیں زورِ حکومت سے روک دی جاتی تھیں۔ جو واقعہ اس وقت ہمارے سامنے ہے وہی صورت بلا کسی تشبیہ کے اس مقدس ذات کے سامنے تھی...... لیکن فنِ نقد جس کی غایت سے ہر شخص واقف ہے، اس وقت بھی موجود تھا اور آج بھی ہم اس سے روکے نہیں جا سکتے اور اسی بنا پر ہم کو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس لغو قصیدہ کو غالب سے منسوب کرنا ایسی شرمناک اور کھلی ہوئی غلطی ہے جس پر بحث کرنے کے لیے زیادہ صفحات کی ضرورت نہیں ..... ریختہ میں مرزا غالب کی تین خصوصیتیں ہیں جو رفتہ رفتہ ان کی عمر کے ساتھ ان کے کلام میں پیدا ہوئیں۔ اول اول عنصر فارسی کے غلبہ کی وجہ سے جب ریختہ لکھنا شروع کیا تو الفاظ متغلقہ کثرت سے استعمال کیے اور گو مضمون آفرینی کے لحاظ سے وہ وقت پسندی چنداں ناگوار نہ ہو لیکن ریختہ کے مناسب حال نہ تھی ......

اس کے بعد ان کی اردو شاعری کا دورِ ثانی آیا جس میں مشکل الفاظ کم ہوگئے لیکن مضمون آفرینی کا وہی عالم رہا تیسرا۔ دور انکی شاعری کا وہ تھا جب انھوں نے ریختہ پر حقیقتاً "احسانِ عظیم کیا" اس سادگی و سلاست کے ساتھ جو کسی زمانہ میں میر کا حصّہ ہو چکی تھی...... آپ...... شروع سے آخر تک دیکھ جائیے لیکن کسی جگہ ایسی ترکیبیں نہ پائیے گا۔ جو ذوقِ سلیم پر بار ہوں اور ان میں عمومیت پائی جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ قصیدہ ان کی شاعری کے کس دور سے متعلق ہو سکتا ہے۔ وہ تحقیقات جو اس قصیدہ کی نسبت ایڈیٹر صاحب الہلال نے کی ہے، ظاہر کرتی ہے کہ یہ کلام ان کے آخری زمانہ کا ہے جب وہ غدر کے بعد بہت پریشان و مضطرب الحال تھے۔ اس دور کی خصوصیات کو پیشِ نظر رکھ کر جب ہم اس قصیدے کو دیکھتے ہیں تو بصد افسوس کہنا پڑتا ہے کہ اس قصیدہ کا ایک شعر کیا ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں جس کو ہم اس عالی دماغی و نازک خیال شاعر سے منسوب کریں...

تمام قصیدہ محتاجِ تنقید ہے...... چند شعروں پر ہم نظر ڈالتے ہیں....

حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس

نواب مستطاب امیر شہ احتشام

جس شخص کو فارسی سے ذرا بھی درک ہے اور جس نے کلام غالب کا تھوڑے تامّل کے ساتھ بھی مطالعہ کیا ہے وہ ایک لمحے کے لیے بھی حق حق کی اس غیر مانوس تکرار کو جس کے بعد ہر جگہ واؤ عاطفہ نے بھی لطف پیدا کر دیا ہے، غالب سے منسوب کرنا گوارا نہ کرے گا۔ اور قیامت تک انکی سمجھ میں نہ آئے گا کہ شہ کی ہ کے بعد احتشام کے الف کا تقطیع سے گرنا جبکہ اس صورت میں ہائے ہوز جائے حطّی سے مل کر ایک سخت ناگوار اور کریہہ آواز پیدا کر رہی ہے کیونکر غالب کی انشاء ہو سکتی ہے؟ چوتھے شعر کا پہلا مصرع جس بزم میں کہ ہو اٹھیں آئینِ مے کشی، [1]

---

[1] دیوانِ غالب طاہر ایڈیشن میں "آہنگِ مے کشی" ہے، اس سے عبارت کچھ مربوط ہو جاتی ہے یعنی جس بزم میں وہ مے کشی کا ارادہ کریں (رضا)...... پورا شعر یوں ہے ؎

جس بزم میں کہ ہو اٹھیں آئینِ مے کشی

واں آسماں شیشہ بنے، آفتاب جام

قابلِ ملاحظہ ہے، جس میں آئینِ کشتی کے ساتھ ہونا کسی طرح سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کیا معنی رکھتا ہے؟ .....

آٹھویں شعر میں 'حق کے تفضلات' بھی عجیب چیز ہیں۔ اس نوع کی جمع اور اس حسن کے ساتھ کلام غالب میں پہلی مثال[1] ہے۔ اس سے آگے کے شعر میں 'تحریر ایک جس بری طرح نظر پڑی' سے دور دوسرے مصرع میں جا پڑتی[2] ہے غالب کی قادر الکلامی سے بعید ہے۔ چودھویں شعر کا دوسرا مصرع، 'استادہ ہو گئے۔ لبِ دریا پہ جب خیام[3]' جس قدر سامانِ ظرافت اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے اور اس کا اظہار جس حسن کے ساتھ 'خیام کی استادگی'، اور 'لبِ دریا' کے بعد اس لفظ 'پہ' سے ہوتا ہے، اس کی داد دینے کے لیے یہ زبان کہاں سے لائی جائے؟ یہ حسنِ بیان مخترع کے لیے وجہِ نازش ہو تو ہو غالب کے لئے قطعاً باعثِ ننگ ہے۔

اس کے بعد غالب کو نشست میں 'از روئے اہتمام[4]' نمبر ملا اور یہ ہوا کران کو ناگوار، تو وہ سولھویں شعر میں اس تاثر کو یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

سمجھا اسے گراب ہوا پاش پاش دل

دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمکِ عوام !

عوام کی چشمک کا دربار میں چلنا اور اسے غالب کا گراب سمجھنا، سمجھ میں نہیں آتا کہ غالب کی نازک طبیعت اس ثقالت کی کہاں تک متحمل ہو سکتی ہے[5]۔ اور یہ 'تخیلات'، یہ لطافتِ زبان کس طرح اس لطیف حسیات کے مالک دماغ سے منسوب کیے جا سکتے ہیں؟

لیکن ہمارا تحیر و اضطراب جاتا رہتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ غالب نے اس قصیدے کے انیسویں شعر[6] میں ریل کے کھلنے کا وقت ظاہر کر کے اردو زبان کو ناقابلِ برداشت صدمہ پہنچایا ہے اور اکیسویں[7] شعر کا پہلا مصرع لنگِ تقطیع پورا کرنے کے لئے ایک حرف کو ترس رہا ہے اور تیسویں شعر میں 'مدح خوان[8]' کا اعلانِ نون

1۔ پورا شعر یہ ہے ؎ میری سنو کہ آج تم اس سرزمین پر ؛ حق کے تفضلات سے ہو مرجعِ انام

2۔ ؎ اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی ؛ تحریر ایک، جس سے ہوا بندہ تلخ کام

یہ قطعی غالب کا انداز ہے اس نے کئی مقامات پر اس اسلوب کو برتا ہے (رضا)

3۔ ؎ تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرہویں ؛ استادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام

4۔ اس بزم پر فروغ میں اس تیرہ بخت کو ؛ لمبر ملا نشیب میں از روئے اہتمام

5۔ یہ زبان غالب کے لئے غیر مانوس نہ تھی ۱۸۵۷ء کے بعد سکے کا الزام ان پر آیا تو انھوں نے لکھا سکے کا وار ایسا چلا جیسے چھرا یا گراب۔ (رضا) ۶، ۷، ۸ ص ۱۷۳ پر دیکھیے۔

بے چارے غالب کی پوری تشہیر ہے ۔ غرض کہاں تک لکھا جائے ۔ اس قصیدے کا ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو غالب کے رنگ میں ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کلام کلام غالب نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالب ہے جس کا نام"

اس میں شک نہیں کہ یہ کلام، کلام غالب ہی ہے مگر یہ قطعی بیانیہ اور سپاٹ ہے، شعریت نام کو نہیں، شاید اسی لئے غالب نے اسے اپنے دیوان کے لئے منتخب نہیں کیا ۔

(۳۱)

ماہنامہ نقیب ۔ بدایوں ۔ مارچ ۱۹۱۹ء ۔ ص ۳۶

ایڈیٹر نقیب فرماتے ہیں ۔

"مرزا غالب کی یہ غزل، جو یہاں پیش کی جاتی ہے مولوی صاحب قبلہ (مولوی امیر احمد صاحب امیر بدایونی) کی جدتِ طبع کی بدولت نئی پوشاک میں نمودار ہوتی ہے ۔ قابلِ تعریف یہ خصوصیت ہے کہ مصرع کے شروع میں جو الفاظ زائد بہم پہنچائے گئے ہیں ان سے مرزا کے علوِ تخیل میں فرق آتا ہے اور نہ زبان کا لطف کم ہوتا ہے ۔ ایسی ہی جدت طرازیاں نظم اردو میں چار چاند لگا سکتی ہیں ۔ غالب کے رنگ میں حضرت امیر کو یدِ طولیٰ حاصل ہے، یہ اسی کا ادنیٰ کرشمہ ہے"

امیر صاحب نے غزل کے ہر مصرع کے شروع میں ایک رکن فاعلاتن کا کامیاب اضافہ کیا ہے، یہ کوئی بہت بڑا کارنامہ نہیں ۔ محض تفننِ طبع کے لیے پیشِ خدمت ہے ۔ غالب کا مطلع یہ ہے

جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھکو منہ دکھلائیں کیا

(ص ۲، اسے پیوستہ)

۲ آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب ؛ تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا ازدحام

۳ جو واں نہ کر سکا وہ لکھا حضور کو ؛ دیں آپ میری داد کہ ہوں فائز المرام

پہلے مصرع میں غالباً لکھا کے بعد "ہے" چھوٹ گیا ہے، جو سہوِ کتابت ہے ۔ (رضا)

۵ وکٹوریہ کا دہر میں جو مدح خواں ہو ؛ شایانِ عصر، چاہئے، لیں عزت اس سے وام

وہ تو اپنے جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا
بے تکلف کہتے ہیں ہم تجھکو منہ دکھلائیں کیا

گر یہ سچ ہے، رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ایک دن پھر ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اپنے دل سے لاگ ہو تو اسکو سمجھیں ہم لگاؤ!
لاگ جب دل سے نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

گزری ہے گر موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے!
ڈر کے اب ہم آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا!

کس ادا سے پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
اب تو اتنا کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اسی جدت سے متاثر ہوکر" اودھ پنچ"، لکھنؤ کے بدایوں ہی کے ایک نامہ نگار" کھلے رستم" کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔ اس نے ۱۸ ر اپریل ۱۹۱۹ء کے "اودھ پنچ (جلد ۴ نمبر ۱۶) میں ایک مستزاد بہ عنوان" غالب کی نئی پوشاک میں موزوں کا اضافہ" لکھی اور اس سے پہلے ایک مفصل نوٹ بھی تحریر کیا۔ لیجئے، پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔

"اصل پوشش دیوانِ غالب میں رمل مسدس محذوف کی وضع میں تھی یعنے (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) یا (جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا) اس پر رسالہ نقیب بدایوں مطبوعہ مارچ سنہ ۱۹۱۹ء میں امیر صاحب بدایونی کی طرف سے بطور عمامہ ایک قطعہ" فاعلاتن" کا اضافہ ہوکر بقول ایڈیٹر صاحب رسالۂ مذکور نظم اردو میں چار چاند لگے۔ تو بحر رمل مثمن محذوف ہوگئی۔ یعنے "فاعلاتن (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) یا" وہ تو اپنے (جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا) یہ دیکھ کر اب جانب ہر مصرعے کو دو قطعہ مستفعلن کا ایک ایک موزہ نذر کر کے نظم اردو میں چار چاند اور اضافہ کر کے آٹھ چاند بلکہ باعتبار تعداد ارکان بارہ چاند نصب کردیے۔ یعنی پورے ایک درجن ۔ گر قبول افتد زہے عزو شرف ۔ اور اب بحر مذکور" رمل مثمن محذوف مع الرجز" مربع سالم الارکان یعنی" فاعلاتن (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) مستفعلن مستفعلن"

یا "وہ تو اپنے (جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا) غیرت انھیں کھا جائیگی"

مکمل پوشاک ذیل میں اس تفصیل سے درج ہے کہ بریکٹ سے قبل عمامہ عطیہ امیر صاحب بدایونی، بریکٹ کے اندر اصلی پوشاک اور بریکٹ کے بعد اپنی جانب کا نذرانہ یعنی موزے۔ اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ بہ ہیئت موجودہ اس بارہ برجی (بارہ چاند ہیں تو بارہ برج بھی ہونے چاہئیں) شاعری کا اسم مبارک کیا ہوگا تو جناب اس کا نام نامی ہے "مستزاد جدت نہاد"

ملاحظہ ہو۔

وہ تو اپنے (جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا) غیرت انھیں کھا جائیگی

بے تکلف (کہتے ہیں ہم تجھکو منہ دکھلائیں کیا) تجھ سے ہمیں شرم آئیگی

گر یہ سچ ہے (رات دن گردش میں ہیں سات آسماں) شاہد ہے نیرنگ جہاں

ایک دن پھر (ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا) ہاں رات بھی پھر آئیگی

اپنے دل سے (لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ) واعظ تمہیں ہم کو بتاؤ

لاگ دل سے (جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا) کیا چیز پھر بہکائے گی

گزری ہے گر (موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے) غوطہ ہی لاشہ کیوں نہ کھائے

ڈر کے اب ہم (آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا) بس جان ہی تو جائیگی

کس ادا سے (پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے) مرنے کا طالب کون ہے

اب تو اتنا (کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا) ڈرتے ہیں موت آجائیگی

(۳۲)

پیام یار لکھنؤ - اپریل ۱۸۹۱ء ص ۱۲

کرامت علی صفا[۱]، لالہ گنگا پرشاد[۲] اور بالمکند بے صبر جو غالب کی شاگردی اختیار کرنے سے پہلے منشی ہرگوپال تفتہ سے اصلاح لیا کرتے تھے سوائے ہمیں تفتہ کے کسی اور شاگرد کا علم نہیں مگر پیام یار، کا مندرجہ بالا شمارہ ان کے ایک شاگرد کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان کا نام تھا بدری کرشن اور فروغ تخلص تھا ۱۸۹۱ء میں دہلی میں وکالت کرتے تھے۔ طرحی غزل کے دو شعر درج کیے جاتے ہیں ؎

وہ آہ جو تھی باعثِ ویرانیٔ دنیا

جاتی ہے فلک پر دلِ مضطر سے نکل کر

کل شام درِ میکدہ سے شیخ و برہمن

پوشیدہ گئے میرے برابر سے نکل کر

یہ وہی فروغ ہیں جنھوں نے ہرگوپال تفتہ کی وفات (۱۸۷۹ء) پر ذیل کا قطعہ تاریخ کہا تھا ؎

ستمبر ستم ہا بعالم گذاشت

کہ از دہر سوے جناں تفتہ رفت

دوم روز در دہر ماتم دوچند

ز جورِ فلک الاماں تفتہ رفت

سنِ عیسوی گفتم آخر فروغ

"چہ سوئے جناں زیں جہاں تفتہ رفت

تفتہ کا انتقال ۲ ستمبر کو ہوا تھا اس لئے پہلے اور تیسرے مصرع کے الفاظ ستمبر اور دوم روز معنی خیز ہیں۔ ہندو شعراء (عشرت لکھنوی) میں فروغ کو سکندر آباد کا رئیس اور وکیل دہلی لکھا ہے۔

ذیل کا شعر بھی دیا ہے ؎

بت و بت خانہ و دیر و کنشت و کعبہ و مسجد

متاعِ پارسائی سب ہوئی جاگیرِ مے خانہ

(۴۳)

بحر الفصاحت۔ محمد نجم الغنی۔ مطبع نولکشور ۱۹۱۷ء ص ۱۰۶۲

"ایک روز شہر بھوپال میں یار محمد خاں صاحب شوکت (شاگردِ غالب) کے مکان پر چند احباب کا جلسہ تھا مؤلف (محمد نجم الغنی) بھی حاضر تھا۔ خاں صاحب موصوف نے ان اشعار کو اپنے نام پر پڑھا اور بجائے صابر اپنا تخلص شوکت کر دیا۔

(ص ۱۷۵ سے پیوستہ)

ل اردوئے معلیٰ، اکمل المطابع دہلی ۱۸۶۹ء ص ۶۷ غالب بنام ہرگوپال تفتہ (خط مورخہ ۳ جنوری ۵۹ ۱۸ء)

ک اردوئے معلیٰ۔ اکمل المطابع دہلی۔ ۱۸۶۹ء ص ۹۲۔ غالب بنام ہرگوپال تفتہ (خط مورخہ ۲۷ نومبر ۵۸ ۱۸ء)

ہو فنا ذات میں کر تو نہ رہے

تیری ہستی کا رنگ و بو نہ رہے

اس قدر ڈوب اس میں اے صابر

کہ بجز ہُو کے غیر ہُو نہ رہے۔

شوکت غالب کے علاوہ غالب کے ایماء سے مولانا رفعت بھوپالی سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ شوکت کے نام آج تک جو کچھ منسوب ہے اس میں رفعت کا بھی کافی حصّہ ہے۔ چونکہ اس واقعہ کے راوی خود جائے وقوع پر موجود تھے۔ اس لئے شوکت کے اس فعل کو سرقے کے سوائے دوسرا نام دیا نہیں دیا جاسکتا۔

(۳۴)

ماہنامہ جلوۂ یار۔ میرٹھ۔ شمارہ جنوری ۱۹۱۵ء ص ۳۳

مولانا حالی کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے اس ماہنامے کے ایڈیٹر لکھتے ہیں۔

"مولانا حالی، دبیر الملک نواب اسداللہ خاں غالب مرحوم کے تلامذۂ عمدہ میں سے تھے۔ خود میرزا مرحوم حالی کے اردو اشعار کے عمدہ اور ٹکسالی ہونے کے معترف تھے چنانچہ اپنے کسی خط میں مولانا حالی کی نسبت یہ جملہ یا اس قسم کے جملے لکھتے ہیں۔

"میرا مذاقِ اردو پانی پت محلہ انصاریاں کا رہنے والا لوٹ کر لے گیا۔"

بس غالب ایسے کامل بلکہ مکمل ماہر فنِ شاعری کے الفاظ حالی کے کمال کے لئے کافی ہیں ......"

بعض لوگ لاعلمی میں آج بھی اس جملے کو حالی ہی کے لیے کہا ہوا مانتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ غالب نے میر مہدی مجروح کے لئے کہے تھے۔ جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے میں دلی سے نکل کر پانی پت چلے گئے تھے۔ اور وہاں انصاریوں کے محلہ میں رہتے تھے۔ غالب نے یہ خط مجروح کے نام ۷ مارچ ۱۸۵۹ء کو لکھا تھا۔ ضروری اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔

"جیتے رہو، آفرین صد آفرین۔ اردو عبارت لکھنے کا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا۔ سنو، دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی سو ایک ظالم پانی پتی

الضار یوںکے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔"

حالی کا انتقال ۳۰ دسمبر ۱۹۱۴ء کو ہوا۔ اور جلوۂ یار جنوری ۱۹۱۵ء کے شمارے میں یہ جملہ جس بے ساختگی سے حالی سے منسوب کر دیا گیا ہے، وہ اس بات کی غماز ہے کہ حالی کی کھلے بندوں تردید اور وضاحت کے باوجود غالب کا یہ جملہ حالی ہی سے منسوب رہا۔ "یادگارِ غالب" میں حالی کہتے ہیں کہ "میں نے جس قدر ان (لوگوں) کو سمجھایا کہ یہ تو میر مہدی (مجروح) کی نسبت لکھا ہے، میری نسبت نہیں لکھا۔ اسی قدر اُن کو اس بات کا زیادہ خیال ہوا کہ میں ازراہِ کسرِ نفسی ایسا کہتا ہوں۔"

اسی شمارے میں حالی کی وفات پر قطعاتِ تاریخ بھی درج ہیں۔ جو تجمل جلالپوری کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

شمعِ حیاتِ حضرتِ حالی بھی بجھ گئی ÷ بے نورِ علم وفضل کی ہر انجمن ہوئی
مصرعِ سالِ مرگ تجمل سناؤ تم ÷ ہے ہے وفاتِ حالی اہلِ سخن ہوئی

۱۳۳۳ھ

ادب ان کا کرتے تھے اربابِ معنی
بزرگ ایسے ہی تھے حقیقت میں حالی
گئے سیدھے فردوس دارالمحن سے
کرم سے خدا کے ہیں راحت میں حالی
تجمل سنا دو یہ سالِ مسیحی
بآرام ہیں باغِ جنت میں حالی

۱۹۱۴ء

تجمل جلالپوری (حاجی تجمل حسین تجمل) ایک مدت تک بمبئی میں مقیم رہے۔ شاعری میں مولانا تائب شاہجہانپوری سے تلمذ تھا۔

(۳۵)

ماہنامہ مخزن۔ لاہور نومبر ۱۹۰۴ء ص ۱

رسالے کے ایڈیٹر شیخ عبدالقادر نے مولانا الطاف حسین حالی کے لیے اپنی عقیدت کا اظہار ذیل کے الفاظ میں کیا ہے جن سے معمولی ہی سہی، چند ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے جو عام طور پر معلوم نہیں۔ مثلاً یہ کہ حالی کی رباعیوں کا انگریزی میں ترجمہ ۱۹۰۴ء سے پہلے ہو چکا تھا۔

"...... گو خطاب شمس العلماء سرکاری طور پر حال ہی میں آپ (حالی) کو عطا ہوا ہے۔
تاہم فی الواقع وہ دیر سے اس خطاب کا اور اس سے بہتر خطابات کا استحقاق حاصل
کر چکے ہیں ...... سخن کے لئے مناسبتِ طبعی قدرت سے عطا ہوئی ہے، اس پر غالب
رنگیں بیاں کی صحبت اور اصلاح کا اثر اور دلّی کی شاعری کے دورِ آخر کی جرعہ نوشی یہ
وہ نعمتیں ہیں، جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہیں ...... آپ کی تصانیفِ نظم میں عام
رائے دوام کا سہرا مسدس، مدوجزرِ اسلام کے سر باندھتی ہے۔ مگر ہمارے خیال میں دیوانِ
حالی بھی نہایت قدر کے قابل ہے اور اس میں خصوصاً آخری حصے میں حکیم محمود خاں
مرحوم کا مرثیہ اور بھائی کے انتقال اور غالب کی وفات کے متعلق جو درد انگیز بند ہیں
نہایت ہی دیرپا شہرت پانے والی چیزیں ہیں ...... حال میں ان کا نام بذریعہ رباعیات
حالی کے انگریزی ترجمے کے انگلستان تک پہنچ گیا ہے۔ یہ ترجمہ مسٹر جی، ای، وارڈ
صاحب بہادر ایم اے نے جو سول سروس سے پنشن یاب ہو چکے ہیں، بکمالِ لیاقت تیار
کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ رومن حروف میں اصل رباعیات بھی درج کی ہیں۔ مولانا
حالی مخزن کے اولین سرپرستوں میں ہیں۔ آپ نے سب سے پہلے چندہ ارسال فرما کر ہماری
ہمت بڑھائی تھی اور گو اب بوجہ کم فرصتی اور ضعفِ صحت مخزن کو باقاعدہ نہیں دیکھتے
تاہم انھیں حق ہے کہ اسے خطاب کر کے فرما دیں ؎

اوّل آں کس کہ خریدار شدش من بودم

باعثِ گرمیٔ بازار شدش من بودم

خطاب کی خبر زمانہ میں پہلے ہی شائع ہو چکی تھی (دیکھیے زمانہ جولائی و اگست ۱۹۰۴ء ص ۱۳۲)

"جشنِ سالگرہ کے خطابات میں یہاں پر علمی دلچسپی کے لحاظ سے مولانا حالی کے اعزاز
کا تذکرہ ضروری ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کی علمی خدمات، اظہر من الشمس ہیں۔ مولانا
موصوف ان چند اصحاب میں ہیں جنھوں نے اپنی بیش بہا زندگی ملک کی علمی خدمات کیلئے
وقف کردی ہے۔ اور جن کے احسانات سے زبانِ اردو سبکدوش نہیں ہو سکتی شکر ہے کہ
آخر کار گورنمنٹ نے ان احسانات کا لحاظ کر کے انھیں شمس العلماء کا معزز خطاب
عطا فرمایا۔ خدا کرے مولانا موصوف عرصہ تک اس خطاب کے مخاطب رہیں"

(۳۶)

گلزارِ سخن۔ جگناتھ فیض۔ مطبوعہ تاریخ ختم کتاب ۱۹۰۸ء

'گلزارِ سخن' میں ایک باب شجرۃ الشعراء لکھا ہے، جس میں ولی، سرب سکھ دیوانہ، میر تقی میر، خواجہ میر درد، نصیر ذوق، میر سوز، مصحفی، ناسخ، وغیرہ کے شجرے ہیں۔ ایک شجرہ غالب سے متعلق بھی ہے، عنوان ہے۔

ص ۵۱۶ "اسد اللہ خاں غالب نواب مرزا نوشہ غالب کا سلسلۂ تلامذہ یعنی شجرہ درفن شاعری"

اس میں غالب کے صرف ۱۶ شاگردوں کا ذکر ہے، جن کے تخلص حسبِ ذیل ہیں۔

عالم، چمن، رضوان، قدر، عزیز، عاشق، حزیں، مقصود، خضر، سخن، حالی، میکش، شاداں، افسر، آذر، ثاقب

ان میں تین تخلص (عالم، چمن، افسر) ایسے ہیں، جن کا ترجمہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا، حتیٰ کہ گلزارِ سخن میں بھی نہیں۔ شجرے کے پھول پتے ظاہرا نہایت خوبصورت ہیں مگر فریب سے خالی نہیں۔

(۳۷)

تذکرۂ نادر۔ مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب۔ ۱۹۵۷ء

مرزا کلب حسین خاں نادر شاگردِ ناسخ نے اپنے مخمسوں کا ضخیم مجموعہ "دیوانِ غریب" کے نام سے ۱۲۸۳ھ میں ترتیب دیا تھا جو منشی رام سروپ کے مطبع دلکشا واقع فتح گڈھ سے ۱۲۸۴ھ میں چھپا تھا۔ اس میں نادر نے تقریباً پانچ سو شاعروں کی غزلوں کو مخمس کیا ہے اور ان سب شاعروں کے حالات بھی مختصراً لکھ دئیے ہیں۔ یہ تذکرہ انھیں پر مبنی ہے اور اس میں اتفاق سے غالب کے چند شاگردوں کا حال بھی درج ہے۔ میں یہاں ان میں سے بے صبر، مداح اور مفتوں کا ذکر کروں گا۔

مداح: نساخ (تذکرہ سخن الشعراء ۴۲۶) لکھتے ہیں:۔

"مداح تخلص شیخ محمد صادق علی مقیم سکندرہ ضلع علی گڈھ، مرزا نوشہ غالب کو

اپنا استاد بتلاتے ہیں اور سوزاں بھی تخلص کرتے ہیں۔

اس کو بلوایا تو ہے لطف تب اے دل آئے
ساتھ تلوار بھی لائے جو وہ قاتل آئے

ایسا نہ ہو کر ظلم سے بھی ہاتھ اٹھائے یار
کیوں کہیئے ناز اٹھانے کی طاقت نہیں رہی

نساخ کے اس جملے سے "... غالب کو اپنا استاد بتلاتے ہیں،، ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اطلاع مصدقہ نہیں مگر تذکرۂ نادر۔ اس التباس کو دور کرنے میں مدد کرتا ہے۔ دیکھیے ص ۱۴۲ "مداح شیخ محمد صادق علی مقیم سکندرہ راؤ ضلع علی گڈھ شاگرد جناب مرزا اسد اللہ خاں غالب سے

ضعف نے آہ و فغاں کی بھی نہ چھوڑی طاقت
لب پہ نالے بھی جو آئے تو بمشکل آئے!
نہ رہی یاد رہِ عشق غرض بھول گیا
ساتھ ہر چند خضر بھی کئی منزل آئے!
شمع تھرانے لگی یار کی آمد سن کر!
رنگ اڑ جائے جو وہ رونق محفل آئے
نہیں مداح کوئی حضرتِ غالب کا نظیر
کس کو دعویٰ ہے سخن کا جو مقابل آئے

چونکہ نساخ اور نادر دونوں کے تذکرے غالب کی زندگی ہی میں مرتب ہو گئے تھے۔ اس لئے یہ تسلیم کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہونا چاہئے کہ مداح (بقول نساخ۔ سوزاں[2] بھی) غالب کے باقاعدہ شاگرد تھے "سرودِ غیبی المسمیٰ بہ خیابانِ تواریخ،، مولفہ محمد علی جویا مرادآبادی کے ص ۷۷ اور ص ۹۱ پر دو تاریخی قطعے درج ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مداح کا دوسرا تخلص سوزاں درست ہے اور کہ اس نے ایک تذکرہ "تذکرۂ سوزاں،، کے نام سے جمع کیا تھا، فی الحال یہ معلوم نہیں کہ یہ تذکرہ چھپا تھا کہ نہیں

---

[1] اس غزل کا مطلع وہی ہے جو نساخ نے دیا ہے، دوبارہ درج نہیں کیا گیا۔

[2] سوزاں کے تحت کسی تذکرے میں ذکر نہیں ملا۔

قطعے یہ ہیں :-

ص ۷۷ "تاریخ تذکرۂ سوزاں شاعر بلند شہر
جن کا تخلص آپ مداح ہے

گلشنِ نازِ سخن ہست ایں با نواعِ سخن
ہم کلام سہل و ہم مضمونِ نازک ہم ارق
از حروفِ معجمہ و مہملہ تاریخ گفت !
روضۂ فردوس و رشکِ صد جمالِ ہر ورق
۱۲۸۳ از معجمہ و از مہملہ ۱۲۸۳ "

ص ۹۱ " یہ تاریخ میاں صادق علی سوزاں، مداح کے تذکرے کی ہے۔

جمع کیا تذکرہ سوزاں نے خوب
ہو گئی کچھ روزوں کو قدرِ سخن
نظم کے افلاک کا جو یا تو کہہ
مادۂ سال ہے بدرِ سخن [1]
۱۸۶۸ء

مشہور رسالہ "مرات الاشباہ" (ص ۱۰۳، ۱۰۴) پر مداح کے تین تاریخی قطعے اس عنوان کے ساتھ درج ہیں:
" قطعاتِ تاریخ طبع از نتائج افکار، ناظم بے بدل، ناثر بے مثل، ہمدوشِ خیر و فلاح محمد صادق علی صاحب مداح، مقیم سکندرہ راؤ ضلع علی گڑھ، تلمیذ با تمیز نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب

شدہ طبع در مطبعِ ارتضیٰ خاں
کتابِ مجالاتِ شاہانِ ذی جاہ

---

[1] اگرچہ کتاب میں ۱۸۶۸ء چھپا ہے۔ مگر ۱۸۶۶ء چاہیے کیونکہ ۱۲۸۳ھ سے یہی سال مطابق ہوتا ہے۔ بدرِ سخن کے ۹۱۶ میں "نظم کے افلاک" یعنی ن ظ ک کے ۹۵۰ عدد ملائے جائیں تو ۱۸۶۶ء برآمد ہو سکتا ہے۔

رقم کرد مدّاح تاریخِ طبعش

کہ وہ طبع گردیدہ مرآتِ اشباہ

در مطبع چہ مطبوع شدہ عمدہ کتابے

باطرزِ خوش اسلوب و بہ زیبائیِ مضموں

مدّاح رقم کردہ چہ تاریخ خجستہ

مطبوع شدہ نسخۂ بازیب ہمایوں

خوش عروسِ کتاب پُر زینت

گشتہ آراستہ بہ زیورِ طبع!

گفت مشاطۂ خرد تاریخ!

چہ شد آراستہ بہ زیورِ طبع

بعض کا خیال ہے کہ مدّاح تخلص صرف نعتِ رسول کے لئے مخصوص تھا، ورنہ عاشقانہ کلام میں تخلص سوزاں رہتا تھا۔ تذکرۂ نادر کی غزل کا مقطع اس کی تغلیط کے لئے کافی ہے۔

بے صبر: "لالہ بالمکند متوطن سکندر آباد ضلع بلند شہر خلف لالہ کانجی مل شاگرد لالہ ہرگوپال تفتہ [1]

خانۂ دل سے ہزاروں مل گئے گھر خاک میں

قصد منعم کو ہے دولت خانہ کی تعمیر کا

خواب بخت اپنے میں گر وہ دولتِ بیدار آئے

ہو معبّر یوسف اپنے خواب کی تعبیر کا

آدمی کی کٹتی ہے بے صبر کس سختی سے عمر

پیر ہونا طفل کا آنا ہے جوئے شیر کا!!"

جیسا کہ پہلے (تذکرۂ نادر ص ۴۴) بیان ہوا، نادر نے بے صبر کو ہرگوپال تفتہ کا شاگرد لکھا ہے حقیقت یہ ہے کہ

---

[1] اس غزل کا مطلع اور ایک شعر تلامذۂ غالب میں درج ہیں۔ اس لئے حذف کئے گئے۔

وہ پہلے تفتہ کے بعد میں غالب کے شاگرد ہوئے تھے۔ جس وقت تذکرہ نادر لکھا گیا تھا' اس وقت بے صبر یقیناً غالب کے شاگرد تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نادر کو بہت پہلے کی چھپی ہوئی یا لکھی ہوئی غزل مل گئی جس کے عنوان میں بے صبر نے اپنے آپ کو تفتہ کا شاگرد لکھا ہوگا۔ نادر نے دوبارہ اس کی تصدیق کی ضرورت نہ سمجھی اس طرح اس غزل کو بے صبر کی ابتدائی غزلوں میں شمار کرنا چاہئے۔ غزل غالب کی مشہور زمین میں ہے۔

مفتون: (پنڈت لچھمی نارائن خلف پنڈت گوبر دھن داس متوطن فرخ آباد) کا حال کئی تذکروں میں مل جاتا ہے۔ تلامذۂ غالب میں بھی کافی حالات درج ہیں۔ مگر صرف ۱۶ اشعار (۷ اردو کے اور ۹ فارسی کے) دیئے ہیں۔ یہاں تذکرۂ نادر (ص ۱۴۸) سے مزید چار شعر دیے جاتے ہیں تاکہ ایک جگہ محفوظ ہو جائیں۔

مرغ بسمل ہو گئے میرا تڑپنا دیکھ کر
لوٹ ہیں اہلِ تماشہ یہ تماشہ دیکھ کر

کس قدر رم خوردۂ صحرا وحشت ہو گیا
ہاتھ میں نبضِ غزالی میرے عیسا دیکھ کر

گرم ہواب بزمِ نوشانوش بے خوف و خطر
محتسب ساقی بنا تندیِ صہبا دیکھ کر!

آب ہے مفتوں دلِ مفتوں بشکلِ آئینہ
محوِ حیرت ہو گیا اُس کا سراپا دیکھ کر[1]

(۳۸)

مآثر صدیقی۔ حصہ اوّل۔ نولکشور ۱۹۲۴ء ص ۹۷

"مولانا عرشی کو نظم و نثر فارسی میں نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسد اللہ خاں غالب دہلوی مرحوم کا شرف تلمذ حاصل تھا......"

---

[1] تذکرہ بہارِ گلشنِ کشمیر اس وقت پیشِ نظر نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ چار شعر بھی اس میں درج ہوں۔ تلامذۂ غالب میں اس غزل کا صرف ایک شعر دیا ہے۔ جو ان اشعار میں شامل نہیں۔

مولانا احمد حسن عرشی نواب صدیق حسن خاں کے بڑے بھائی تھے۔ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے اور عین جوانی میں بمقام بڑودہ ۱۸۶۰ء میں وفات پائی (مفصل حالات کے لئے دیکھئے مآثر صدیقی حصہ اول ص ۴۷ تا ص ۱۱۰) عربی و فارسی اردو تینوں زبان میں شعر کہتے تھے۔ ان کے بہت سے اشعار مذکورہ بالا کتاب میں درج ہیں۔ قصیدے کے ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

مغلوب ہیں سب اہلِ جہاں میرے سخن سے

ہوں زلّہ ربا غالبِ اعجاز رقم کا!

معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو اشعار پر بھی غالب ہی سے اصلاح لیتے تھے ورنہ فارسی کے بجائے وہ غالب کی شاگردی کا اعتراف اردو میں کیوں کرتے؟۔

(۳۹)

گلزارِ سخن۔جگناتھ فیض۔مطبوعہ۔تاریخِ ختم کتاب

۱۹۰۸ء ص ۱۵۰

"حزیں۔ میر بہادر علی دہلوی ملازم ولی عہد بہادر دہلی
شاگرد زین العابدین خاں عارف و اسد اللہ خاں غالب"

جناب مالک رام (تلامذۂ غالب ص ۹۳) نے لکھا ہے کہ "عارف اور غالب دونوں سے استفادہ کیا"۔ اور حزیں کے ترجمے کا ماخذ طبقات الشعرائے ہند، گلستانِ سخن، گلستانِ بے خزاں، شمیمِ سخن، بزمِ سخن اور خمخانۂ جاوید کو ٹھہرایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تذکرہ گلستانِ سخن اور شمیمِ سخن کے علاوہ کسی نے حزیں کو غالب کا شاگرد نہیں لکھا اور صاحبِ گلستانِ سخن نے بھی صرف یہ لکھا ہے کہ زین العابدین عارف کی وفات کے بعد شاید اب غالب سے استفادہ کرتے ہوں گے۔ ایسی حالت میں حزیں کو غالب کا شاگرد تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ جناب قاضی عبدالودود (جہانِ غالب از قاضی عبدالودود معاصر حصہ ۴) تحریر فرماتے ہیں

"بہادر علی حزیں کے متعلق گلستانِ سخن میں مرقوم ہے کہ یہ ولی عہد میرزا فتح الملک کے ملازم ہیں۔ پہلے عارف کے شاگرد تھے، اور ان کی وفات کے بعد غالباً غالب سے اصلاح لیتے ہیں۔ غالب کی تحریروں میں ان کا ذکر نہیں اور قطعی طور پر اس کا

فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ انھیں غالب سے تلمّذ تھا یا نہیں "۔

(۸۰)

گلزارِ سخن۔ جگناتھ فیض۔ مطبوعہ۔ تاریخِ ختمِ کتاب ۱۹۰۸ء۔ ص ۱۵۲

"منشی نبی بخش صاحب حقیر اکبر آبادی ۔ یہ بزرگ عدالت فوجداری ضلع کول کے سر رشتہ دار تھے۔ ان کے والد کا نام منشی حسین بخش تھا۔ ان کو فارسی میں اچھا دخل تھا۔ ان کا کلام ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

بتا دیں ہم تمہارے عارض و کاکل کو کیا سمجھے
اسے ہم سانپ سمجھے اور اُسے من سانپ کا سمجھے

یہ کیا تشبیہ بیہودہ ہے کیوں موذی سے نسبت دیں
سمن عارض کو اور کاکل کو سُنبل کا جٹا سمجھے

بناتاتِ زمیں سے انکو کیا نسبت معاذ اللہ
ہما عارض کو اور کاکل کو ہم ظلِ ہما سمجھے

غلط ہی ہو گئی تشبیہ یہ بھی ایک طائر سے
اسے برق اور اسے ساون کی ہم کالی گھٹا سمجھے

گھٹا اور برق کیا ہے کیوں گھٹا کر ان سے نسبت دیں
اسے ظلمات اس کو چشمۂ آبِ بقا سمجھے

جو کہیے یہ بھی اک مخصوص تھی خضر و سکندر کی
ید بیضا اِسے اور اس کو موسیٰ کا عصا سمجھے !

جو اس تشبیہ سے بھی داغ ان دونوں پہ آتا ہے
اسے قندیلِ کعبہ، اسکو کعبہ کی رِدا سمجھے!

جو یہ تشبیہ پسند خاطرِ والا نہ ہو تو پھر

اسے وقتِ نمازِ صبح اور اسکو عشا سمجھے

حقیر ان ساری تشبیہوں کو رد کر کے یہ کہتا ہے
سویدا اسکو سمجھے اور اسے نورِ خدا سمجھے

نوٹ: بعض گلدستوں میں یہ غزل ظفر کے نام سے لکھی ہے"

حقیر کا کلام بہت کم دستیاب ہوتا ہے اور جو کچھ فراہم ہوا ہے اس میں مندرجہ بالا غزل کا کوئی شعر شامل نہیں۔ اسی طرح (بہادر شاہ) ظفر کے چار دیوان بھی اس غزل سے خالی ہیں۔ دیوان (جلد اول) میں ۸ شعر کی ایک غزل "آشنا سمجھے" کے قافیہ ردیف میں ہے مگر اس میں اس غزل کا کوئی شعر نہیں ملتا۔ پوری غزل کے مصنف کا تا حال علم نہیں مگر غزل کا مطلع حافظ عبدالرحیم حقیر عظیم آبادی کا ہے جو دیوانِ غالب عرشی میں درج ہے۔

نبی بخش حقیر، گلزار علی اسیر (نظیر اکبر آبادی کے صاحبزادے) کے شاگرد تھے۔ اسیر ۱۸۷۷ء میں یعنی غالب کی وفات کے آٹھ سال بعد مرے۔ حقیر ۱۸۶۰ء میں انتقال کر چکے تھے۔ تاہم کسی تذکرے نے نہیں لکھا کہ حقیر کو غالب سے بھی تلمذ تھا۔ حقیر کا درجِ ذیل شعر غمازی کرتا ہے کہ حقیر غالب کو دوست سمجھتے تھے نہ کہ استاد

حقیر آگرہ میں ہم ملے ہیں غالب سے
زہے نصیب کہ دیدار دوست کا دیکھا

غالب، حقیر کو سخن فہمی میں یکتا مانتے تھے، حتیٰ کہ ۸ مارچ ۱۸۵۵ء کے خط میں یہاں تک لکھ دیا ہے

"ان دنوں میں دو رباعیاں لکھی ہیں۔ ان کو بنظرِ اصلاح دیکھو۔"

یہ دونوں رباعیاں ~~کہی~~ (وہی) ہیں جو غالب کے متداول دیوان میں شامل ہیں۔ دوسری رباعی کے پہلے مصرع "ہم گرچہ ہوئے سلام کرنے والے" میں ہوئے کو بنے لکھا ہوا بھی ملتا ہے ان دو رباعیوں میں اور کوئی ترمیم نہیں۔ حقیر نے بہ نظرِ اصلاح تو کیا دیکھا ہوگا اشعار کی خوبی کو تسلیم کرتے ہوئے صاد کر دیا ہوگا، اور جیسا کہ غالب کے خط کے اقتباس سے ظاہر ہے وہ چاہتے بھی یہی تھے۔

اس بات سے قطع نظر کہ حقیر نے باقاعدہ غالب کا تلمذ اختیار کیا تھا یا نہیں۔ یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ حقیر نے غالب سے اپنے اشعار پر اصلاح ضرور لی ہے۔ "نادراتِ غالب" میں شامل غالب کے دو خط (ایک ۱۸۴۸ء اور دوسرا ۱۸۵۳ء) اس کے شاہد ہیں مگر تعجب ہے کہ اس پانچ سال کے وقفے میں لکھے ہوئے

---

[1] یہاں تشبیہ کی آہ گر رہی ہے (رضا) ۔ [ص ۱۸۶ سے پیوستہ]

کسی اور خط سے مترشح نہیں ہوتا کہ حقیر نے غالب سے اصلاح لی ہو۔ کیا حقیر برسوں بعد ایک آدھ غزل اصلاح کے لئے بھیجا کرتے تھے؟ کیا اس بنا پر انھیں غالب کا باقاعدہ شاگرد تسلیم کر لینا چاہئے؟

(۷۱)

تلامذۂ غالب۔ مالک رام۔ مرکز تصنیف و تالیف نکودر۔

ص ۲۱۸

لالہ پیارے لال ظہیر دہلوی، غالب کے شاگرد تھے۔ تلامذۂ غالب میں لکھا ہے:

"قوم کے کائستھ تھے، مجذوب سے آدمی تھے۔ ہمیشہ فکر شعر میں غرق رہتے تھے۔ عین جوانی میں ۱۸۷۴ء میں انتقال کیا"۔

رات دن ایک سا رہتا ہے اُجالا مرے گھر
آتشیں آہ ہے یا آٹھ پہر کی بتی
پڑ گئی دیکھتے ہی ناسورِ جگر میں ٹھنڈک
اس کا پیکاں بھی ہے کیا خوب اثر کی بتی
شبِ فرقت کا اندھیرا نہ گیا، پر نہ گیا
کام کچھ موم کی آئی نہ اگر کی بتی
رات گھر اس کے دیے میں کہیں جلتی تھی ضرور
تارہائے نگہِ اہلِ نظر کی بتی
شمع کی مجھ کو ضرورت نہیں واللہ ظہیر
میری روشن ہے ہر اک مصرعِ تر کی بتی

تلامذۂ غالب کے ماخذ تذکرہ بہارِ سخن اور "آثار الشعرائے ہنود" ہیں۔ "بہارِ سخن" سے ذیل کی باتیں تلامذۂ غالب سے محذوف ہیں:

"ذہانت خداداد تھی، تھوڑے ہی زمانے میں نظم میں بڑا ملکہ حاصل کر لیا تھا۔ جناب غالب آپ کو بے حد عزیز سمجھتے تھے......"

گلزارِ سخن (ص ۲۸۰) میں ظہیر کے ترجمے میں تلامذۂ غالب سے چار شعر زیادہ ہیں :

ماہ کے گرد یہ ہالہ ہے کہ سر کی بتی

دیکھتا کوئی مرے رشکِ قمر کی بتی

دیر میں جا کے جلایا جو بتِ کافر نے

یاالٰہی مرا دل تھا کہ اگر کی بتی

شیخ جی آتشِ دوزخ سے ڈراتے کیوں ہو

خیر اک میں ہی سہی نارِ سقر کی بتی

آج یہ اور شبِ وصل جلالیں دل کو

گُل ہے اور چربیِ مرغانِ سحر کی بتی

"آثار الشعراے ہنود"، "تلامذۂ غالب" کا اولین ماخذ ہے۔ مگر "تلامذۂ غالب" میں لبشاش (مولف آثار الشعرائے ہنود) کے نہایت معتبر ترجمے کو مختصر کر کے لکھا ہے اور مندرجہ ۱۳ میں سے صرف پانچ شعر منتخب کئے ہیں۔ لبشاش کا بیان اور مزید چار شعر ملاحظہ فرمائیے۔

"... شعر کہنے میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ میں نے بھی ان کو اجمیر میں دیکھا، ایک مجذوب سے آدمی تھے اور ہمیشہ فکرِ سخن میں ڈوبے رہتے تھے۔ مگر افسوس کہ عین شباب ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ غزل ان کی جو مشہور ہے یہاں درج کی جاتی ہے"

کس روش مجھکو یہ قاتل نے جلایا پسِ مرگ

نہ ہوا کچھ تو مرے خون میں تر کی بتی

اس نزاکت پہ سپاہی سے بنے پھرتے ہو

پر تلا دیکھئے تلوار کا سر کی بتی

یہ تماشہ تھا کہ وہ شوخ جدھر جا بیٹھا

آپ سے آپ ادھر کو وہیں سر کی بتی

خیرات تو کرو اسکو جلاؤ تو نہیں

خطِ عاشق کی جو کی آپ نے بل کر بتی[1]

---

[1] اس غزل میں کچھ شعر قطعے کی صورت میں ہیں مگر یہاں ترتیب بگڑ جانے کی وجہ سے میں نے انھیں غزل ہی میں ملا دیا ہے۔

تلامذۂ غالب میں لکھا ہے کہ ظہیر نے ۱۸۷۶ء میں مرے مگر اس کا ماخذ کیا ہے؟ "تلامذۂ غالب" کے دونوں ماخذوں میں تو یہ درج نہیں۔

(۴۲)

میاں داد خاں سیاح اور میر غلام بابا خاں۔ کلیاتِ سالک مطبوعہ ۱۲۹۷ھ

(۱) سیاح کے کئی اولادیں ہوئیں مگر کوئی بچہ زندہ نہ رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب بچے کم سنی ہی میں فوت ہو گئے کچھ زیادہ تفاصیل معلوم نہیں۔ مگر دو لڑکوں کا کچھ حال ملتا ہے۔ ایک کی وفات اور ولادت کا، اور دوسرے کی ولادت کا۔ غالب ایک خط مورخہ ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء میں کہتے ہیں:

> "تمہارے یاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اس کا مر جانا معلوم ہوا ۔۔۔۔ تم ابھی جوان ہو۔ حق تعالیٰ تمہیں صبر اور نعم البدل دے ۔۔۔۔"

پھر ایک لڑکا ۱۲۸۹ھ (۷۳-۱۸۷۲ء-۱۸۷۲ء، قرینِ قیاس ۱۸۷۲ء) میں پیدا ہوا جس کی تاریخ قربان علی بیگ سالک نے کہی۔ یہ قطعہ تاریخ کلیاتِ سالک میں موجود ہے۔

تاریخ ولادتِ فرزند میاں داد خاں سیاح شاگرد غالب

'خدا نے حضرتِ سیاح کو دیا فرزند
ہوا ہے خاطرِ سالک کو خرمی افزا
سنا یہ مژدۂ جاں بخش جب تو اس کا حال
"نہالِ تازہ کشتِ امید ہے" یہ کہا

۱۲۸۹ھ

ظاہر ہے کہ یہ اولاد بھی زیادہ عرصہ زندہ نہ رہی ہوگی۔ کیونکہ سیاح لاولد مرے۔ سیاح نے ۱۸۶۵ء میں بعمر ۳۵ سال عارض بی سے شادی کی تھی۔ جو شہر سورت ہی کی رہنے والی تھیں۔ یہ سب اولادیں انھیں کے بطن سے ہوئیں۔ آخر عمر میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی گود لیے تھے۔ لڑکی کی شادی کر دی تھی، مگر لڑکے کو اس کی اوباش طبیعت کے سبب گھر سے نکال دینا پڑا تھا۔ سیاح کے انتقال (۱۹۰۷ء) کے بعد ان کی بیوہ عارض بی کو غلام بابا خاں

کے بیٹے مظفر حسین خاں نے اپنے محل میں بلا لیا تھا۔ عارضی بی نے ۱۹۳۰ء میں بعمر سو سال وفات پائی (میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام ص ۲۳)

(ب) میر غلام بابا خاں سورتی (۱۲۵۰ھ تا ۱۳۱۰ھ) کو سرکارِ انگریزی کی طرف سے دیگر انگریزی خطابات کے علاوہ 'خان بہادر' کا خطاب بھی ملا تھا۔

سالِ اعزاز ۱۲۹۵ھ ہے۔ کلیاتِ سالک میں ذیل کا قطعہ تاریخ موجود ہے۔

قطعۂ تاریخ یافتن خطاب نواب میر غلام بابا خاں

لقب خانی و بہادری از سرکارِ انگلشیہ!

مِلا نواب سورت کو ہے سالک

بہت اچھا لقب خانِ بہادر

دبیرِ چرخ نے دفتر میں اپنے

لکھا ہر جا لقب خانِ بہادر

کہا سالک نے بھی سال اس خوشی کا

"طرب افزا لقب خانِ بہادر"

۱۲۹۵ھ

(۴۳)

اذکارِ شوق، دفترِ برکات، رباعیاتِ مستحسنہ مجموعۂ اشعار

مولوی ممتاز احمد صاحب ممتاز تھانوی (۱۳۲۸ھ)

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے سیاح شاگردِ غالب کا مجموعہ اشعار "میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام" کے عنوان سے ۱۹۵۷ء میں شائع کر دیا تھا۔ میں نے اپنی تصنیف "متعلقاتِ غالب" میں ان اشعار پر مزید دو غزلوں کا اضافہ کیا تھا۔ اب مندرجہ بالا کتاب سے جو ممتاز تھانوی (شاگرد داغ دہلوی و شوق نیموی) کے کلام کا "مجموعہ سہ گانہ" ہے سیاح کے دو قطعات تاریخ دیئے جاتے ہیں۔

ص ۱۰۷ " درِ قلزمِ معنی سیاح جناب منشی
محمد میاں داد خاں سیاح اورنگ آبادی
ثم السورتی

بارک اللہ حضرتِ ممتاز
چھپ گیا آپ کا جریدۂ نعت

اہلِ معنی ہیں وجد میں پڑھ کر
غزل و قطعہ و قصیدہ و نعت

صفحۂ دل پہ کیجئے تحریر !
ہیں وہ مضمونِ برگزیدۂ نعت

سبدِ میوہ ہے ورق کیا ہے
نقطہ نقطہ ہے میوہ چیدۂ نعت

شور انگیزِ عشق ہے ہر شعر
کیا ہے دیواں نمک چشیدۂ نعت

ہر طرف ہیں لگے ہوئے انبار
ٹوٹ کر میوۂ رسیدۂ نعت

نظم میں ہے روانیِ کوثر !
ہے مصنف جوئے کشیدۂ نعت

میں بھی تاریخ طبع وہ لکھوں
جو سراپا ہو جلوہ دیدۂ نعت

کلکِ سیاح نے لکھا مصرع
سرورِ دیں کا ہے جریدۂ نعت

۱۳۰۸

دیگر

طبع گردید ....
گشت ....

۔۔۔۔۔۔۔ لہ

۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔

سخنش ۔۔۔۔۔۔۔۔

گر ز شعرے تو چاشنی ۔۔۔۔

کام جانت از آں شود شیریں

بہرِ تاریخ، طبعِ آں سیاح

گفت گلزارِ نعتِ سرورِ دیں

۱۳۰۸ھ"

(۴۴)

کلامِ مشتاق ۔ ناشر کائستھ اردو سبھا دہلی (۱۹۳۸ء)

منشی بہاری لال مشتاق شاگردِ غالب (۱۸۳۶ء تا ۱۹۰۸ء) کا دیوان چوری ہو گیا تھا بعد ازاں کچھ یاد سے اور کچھ مسودوں سے جو کچھ دستیاب ہو سکا ایک جگہ فراہم کر دیا گیا "کلامِ مشتاق" اسی بیاض سے لے کر شائع کیا گیا تھا۔

اس کے ص ۱۸ پر ۶ شعر کی ایک غزل ہے۔ مطلع اور مقطع یہ ہیں ؎

ہو کس طرح فریبِ نظر ماسوا مجھے

دی ہے خدا نے چشمِ حقیقت نما مجھے

مشتاق دردِ قلب کا ہوتا ہے یاں علاج

محمود خاں کی بزم ہے دار الشفاء مجھے

(۱) پہلے پہل یہ غزل مشتاق کے انتقال (۱۹۰۸ء) کے بعد ان کے بڑے بیٹے چندو لال کی وساطت سے رسالہ

لہ اس قطعہ کے پہلے تین شعر ورق پھٹ جانے کی وجہ سے درج نہیں کیے جا سکے۔

"مخزن"، کے جون ۱۹۰۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی اور اس میں ذیل کے چار شعر زیادہ ہیں ؎

خوئے ستم شعار سے آگاہ ہو گئے ؛ دشمن بھی اب تو دینے لگے ہیں دُعا مجھے
میری ہی آنکھ نیچی ہے گویا کہ شرم سے ؛ آتی ہے ذکرِ وصلِ عدو سے حیا مجھے
زلفیں سنوارتے ہوئے کیجیے معانقہ ؛ لگ جائے میری جان تمہاری بلا مجھے
جاتا ہوں ساتھ ساتھ مگر دل داغ داغ ہوں ؛ لے جائے کوئے یار میں اب رہنما مجھے

(ب) مقطع کے پیشِ نظر چندو لال، مخزن جون ۱۹۰۹ء میں فرماتے ہیں :
"والد ماجد صاحب حکیم محمود خاں صاحب مرحوم کے جلیس تھے اور انھیں کے دیوان خانے میں بیٹھا کرتے تھے۔

(۴۵)

بزمِ غالب ۔ عبدالرؤف عروج ۔ ادارۂ یادگارِ غالب

کراچی مارچ ۱۹۶۹ء

ص ۸۴۳ پر بہاری لال مشتاق دہلوی شاگردِ غالب کے ترجمے میں لکھا ہے :
"غالب کے بعض خطوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منشی بہاری لال مشتاق کی لیاقت علمی معمولی تھی۔ اس سلسلہ میں غالب اکثر ان کو متوجہ کرتے رہتے تھے۔
ایک خط میں ان کو لکھا ہے 'چونکہ تم کو مشاہدۂ اخبار اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت کا شغلِ تحریر ہمیشہ رہتا ہے بہ تقلید اور انشا پردازوں کے تمہاری عبارت میں بھی املا کی غلطیاں رہتی ہیں، تم کو جابجا آگاہ کرتا رہتا ہوں، خدا چاہے تو املا کی غلطی کا ملکہ بالکل زائل ہو جائے ۔۔۔۔'"

غالب کے خط کے اس ادھورے اقتباس سے یہ اندازہ کرنا ٹھیک نہیں کہ مشتاق کی "لیاقت علمی معمولی تھی"، غالب نے کہیں اس طرف اشارہ نہیں کیا۔ مشتاق "اکمل الاخبار" کے مہتمم اور ایڈیٹر تھے اور اچھے خوش نویس بھی تھے۔ ان کی عبارت میں املا کی وہ غلطیاں در آئی تھیں، جو دیکھا دیکھی اخبار والوں

کے یہاں در آیا کرتی ہیں۔ یہاں انھیں غلطیوں کی طرف اشارہ ہے، اس خط کا پہلا حصہ شاہد ہے کہ غالب بہاری لال مشتاق کو کم علم نہیں سمجھتے تھے۔

"مجھ کو تم سے محبت ہے، اس کے دو سبب ہیں، ایک تو یہ کہ تمہارے خال فرخ حال منشی مکند لال میرے بڑے پرانے یار ہیں...... دوسرے تمہاری سعادت مندی اور خوبی اور حلم اور بقدرِ حال علم، اردو نظم و نثر میں تمہاری طبع کی روانی اور تمہارے قلم کی گلفشانی، مگر چونکہ تم کو مشاہدۂ اخبار اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت کا شغلِ تحریر ہمیشہ رہتا ہے ...."

مزید برآں حالی کا انھیں مجموعۂ کلام بھیجنا، داغ کا گلزارِ داغ میں ان کا قطعۂ تاریخ اشامل کرنا، نساخ کا انھیں اپنے تذکرے سخن الشعراء میں درج کرنا، اور ان سے دلی میں اپنی ملاقات کا ذکر کرنا، ظاہر کرتے ہیں کہ غالب کے انتقال کے بعد بھی مشتاق کی اپنے ہم عصر مشاہیر کی نظروں میں اچھی قدر و منزلت تھی۔

(ا) کلام حالی موصول ہونے پر مشتاق نے یہ قطعہ لکھا:

حضرت حالی نے بخشا جب مجھے اپنا کلام
اس کو لے کر میں یہ سمجھا، مجھکو گلدستہ ملا

شاعری میں خضر اے مشتاق! حالی کو سمجھ
شرق کو جس کی بدولت غرب کا رستہ ملا

(کلام مشتاق ص ۶)

(ب) گلزارِ داغ پر قطعہ تاریخ (۱۲۹۲ھ) دیکھیے:

قطعۂ تاریخ رختۂ قلم جواہر رقم
درفنِ شعر مشتاق
منشی بہاری لال

مشتاق

زہے شاعرِ نغز گفتار داغ
کہ در شاعری مے کند ساحری

پے طبع دیوان جستیم سال
چکید از قلم نسخۂ شاعری (گلزارِ داغ۔ مطبع انوارِ محمدی۔ لکھنؤ ص ۳۲۷)

معلم الشطرنج (۱۹۰۱ء) مولّفہ راجا بابو صاحب مہاراجہ پٹیالہ کی، تقریظ حالی کی لکھی ہوئی ہے، اس کے قطعاتِ تاریخ میں ایک قطعہ مشتاق کا بھی ہے:

(ج) قطعۂ تاریخ از خامہ فصاحت ختامہ شاعرِ بے بدل،

استاد کامل، سخنورِ شہرۂ آفاق

لالہ بہاری لال صاحب مشتاق دہلوی

تین نام اس کتاب کے رکھو ÷ جس کی تعریف ہے فراست گنج

دو تو رکھے ہیں خود مصنف نے ÷ "یارِ شاطر" ۔ "معلم الشطرنج"

"مجلس شہ" بھی تم کہو مشتاق ÷ ہے اگر سالِ طبع میں شش و پنج

تاکہ تاریخِ طبع پیدا ہو ÷ اور فارغ ہو طبعِ گوہر سنج

۱۹۰۱ء = ۴۳۸ + ۷۴۲ + ۷۲۱

(د) سخن الشعراء (نساخ) میں مشتاق کا ترجمہ اس طرح ہے:

"مشتاق تخلص لالہ بہاری لال، راقم اکمل الاخبار دہلی، ولد لالہ من بھاون لال باشندہ دہلی شاگرد مرزا نوشہ غالب، ان سے دہلی میں ملاقات ہوئی تھی ؎

یوں تیرے ساتھ بزم میں دشمن کا بیٹھنا

وہ اعتراض ہے کہ اٹھایا نہ جائے گا

ہو گا اثر جو دل میں تو خود جان لیں گے وہ

مشتاق ہم سے عشق جتایا نہ جائے گا

جہاں جاگے وہیں انگڑائیاں لو

یہاں پھیلائی ہے سستی کہاں کی ۔"

نساخ کے دیئے ہوئے پہلے دو شعر "کلام مشتاق" میں شامل ہیں مگر تیسرا شعر شامل نہیں اگرچہ اس زمین میں پوری غزل موجود ہے ۔ "گلزارِ داغ" اور "معلم الشطرنج" کے اوپر دیے ہوئے قطعے بھی "کلامِ مشتاق" میں شامل نہیں ۔

(۲) "ہندوؤں میں اردو" (ص ۴۰۸) میں رفیق مارہروی نے مشتاق کے ترجمے میں لکھا ہے:

"..... فتح گڈھ کے رہنے والے تھے، والد کا نام منشی دل سکھ
رائے تھا..... شروع میں حضرتِ مجذوب کے شاگرد ہوئے پھر مرزا
غالب سے اصلاح لی ...."

اور پھر بطورِ نمونۂ کلام تین شعر درج کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنف نے لالہ بہاری لال مشتاق ولد دل سکھ رائے شاگرد مجذوب مقیم فتح گڈھ اور لالہ بہاری لال مشتاق شاگرد غالب ساکن دہلی کو ایک ہی شخصیت سمجھ لیا ہے۔ اور جو تین شعر بطورِ نمونہ کلام دیئے ہیں وہ بھی اتفاق سے مشتاق شاگرد مجذوب کے ہیں نہ کہ مشتاق شاگرد غالب کے۔ بقیہ ترجمہ جو یہاں حذف کر دیا گیا ہے، مشتاق شاگردِ غالب کا ہے۔

(۳) قربان علی بیگ سالک شاگرد غالب کے 'کلیات سالک (۱۲۹۷ھ) میں مشتاق کا ایک
برجستہ قطعۂ تاریخ شامل ہے۔ یہاں بھی درج کیا جاتا ہے ؎

یہی ہے نظمِ اردوئے معلّی
کہ جس کا آج کل سالک ہے مالک
بجا ہے اس کے چھپ جانے کی تاریخ
"عدیم المثل کلیاتِ سالک"

اِن قطعاتِ تاریخ کے ہوتے کون مشتاق کو کم علم کہہ سکتا ہے۔

(۴۶)

ماہنامہ جلوۂ یار۔ میرٹھ شمارۂ مئی ۱۹۰۹ء ص ۱۴

"جناب منشی نور محمد صاحب ضیا تلمیذ حضرتِ غالب مرحوم

اور پہلو میں مجھے کیا چاہیئے
اک حسیں اچھے سے اچھا چاہیئے

کچھ مریضِ عشق کی بھی ہے دوا
حضرتِ عیسٰی سے پوچھا چاہیئے

ہم نیا لائیں کہاں سے روز دل
روز ان کو اک کھلونا چاہیئے
آئے دن اس ماہ رو کے واسطے
چاند تارے کا دوپٹا چاہیئے
مانگ لے مجھ سے وہ آکر اے ضیا
جس کو مضموں کا خزانہ چاہیئے۔

منشی نور محمد ضیا کا تذکرہ آج تک کسی مقام پر نہیں دیکھا گیا۔ اور نہ کہیں غالب کے سلسلے میں ان کا ذکر پایا گیا ہے۔ اس لیے یہ امر فی الحال تحقیق طلب ہے کہ ضیا غالب کے شاگرد تھے کہ نہیں یہ بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ "حضرت غالب مرحوم" سے مراد مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی ہی ہیں یا کوئی اور۔ البتہ ایک بات یقینی ہے کہ جلوۂ یار یا پیام یار میں جہاں کہیں غالب کے کسی معروف شاگرد کی غزل شائع ہوئی ہے وہاں "تلمیذ/شاگرد، حضرت/جناب غالب مرحوم" ہی لکھا ہے۔ نہ خطابات و القابات کا ذکر ہے نہ نام کا اندراج ہے۔ ان قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضیا غالب ہی کے شاگرد تھے۔ جب یہ غزل (۱۹۰۹ء) شائع ہوئی ہے۔ اس وقت مولانا حالی سمیت غالب کے کئی شاگرد زندہ تھے۔ اگر یہ امر غلط ہوتا تو تردید کر دیتے۔

(۴۷)

ماہنامہ پیام یار لکھنؤ۔ فروری۔ ۱۸۸۸ء ص ۱۴

"جناب شیخ کرم الٰہی صاحب کرم فیروز پوری شاگرد
جناب غالب دہلوی

وہ بھی اب بے چین رہتے ہیں ہماری یاد میں
یہ اثر آیا ہمارے نالہ و فریاد میں
چین یاں ہم کو نہیں ہے واں نہیں ان کو قرار
ہم ہیں ان کی یاد میں وہ ہیں ہماری یاد میں
آپ سے باہر ہوں میں فرطِ خوشی سے اے صنم

تم اگر آجاؤ میرے خانۂ برباد میں !!!

بے سبب خونِ رگِ گردن نہیں ہے موجزن

باڑھ رکھوائی ہے اسنے خنجرِ فولاد میں !

تم ادھر دشمن کے گھر میں چین سے سوتے رہو

ہم اِدھر روتے رہیں شب بھر تمہاری یاد میں

غیر کے آگے یہ پوچھا اس نے مجھ سے لے کرم

تم بھی کیا بے چین رہتے ہو ہماری یاد میں

غالبیات میں شیخ کرم الٰہی کرم فیروزپوری کا ذکر کہیں آیا ہو، یہ میرے علم میں نہیں، تاہم غالب کی وفات کے اُنیس ۱۹ بیس ۲۰ سال بعد ہی کرم کا شاگردِ غالب ہونے کا غلط دعوےٰ جبکہ غالب کے شاگردوں دوستوں اور ملنے والوں کی ایک بھیڑ ابھی زندہ تھی، قرینِ قیاس نہیں۔ پیامِ یار کے ۱۸۸۸ء کے بعد کے شماروں میں بھی اس کی کوئی تردید شامل نہیں۔

(۴۸)

ماہنامہ پیامِ یار لکھنؤ۔ جنوری ۱۸۸۸ء تا اگست ۱۸۸۹ء

مختلف شمارے

سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی ۱۹ اپریل ۱۸۳۴ء تا ۱۱ مئی ۱۸۹۰ء

غالب کے شاگردوں میں صفیر بلگرامی کا ایک مقام ہے۔ وہ غایت درجہ قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا بیشتر اردو کلام ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ صرف دو دیوان "صفیرِ بلبل" (۶۴-۱۸۶۳ء) اور "خم خانۂ صفیر" (۸۱-۱۸۸۰ء) مطبوعہ ہیں[1]۔

---

[1] تصانیف کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (ا) صفیر بلگرامی۔ حیات و کارنامے۔ کلکتہ ۱۹۷۶ء ص ۱۸۱-۱۹۱ از ڈاکٹر ظفر اوگانوی (ب) غالب او صفیر بلگرامی۔ کراچی ۱۹۸۱ء ص ۲۷

صفیرؔ "پیام یار" لکھنؤ کے ماہانہ مشاعروں میں اکثر حصہ لیتے تھے۔ پیام یار کا پہلا شمارہ جون ۱۸۸۳ء کو شائع ہوا تھا۔ میرے کتب خانے میں جنوری ۱۸۸۸ء سے مارچ ۱۸۹۲ء تک کے مختلف شمارے ہیں۔ مگر پہلے دو سال یعنی ۱۸۸۸ء تا ۱۸۹۰ء کے مکمل فائل ہیں۔ ان میں جنوری ۱۸۸۸ء تا اگست ۱۸۸۹ء (کل بیس شمارے) کے شماروں میں صفیرؔ کی ۱۷ غزلیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ سن کے لحاظ سے یہ غزلیں ان کے مطبوعہ دیوانوں میں شامل نہیں ہو سکتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے غیر مطبوعہ دیوانوں میں شامل ہوں۔ قارئین کے مطالعہ کے لئے یہ غزلیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ جو صفیرؔ کے آخری زمانے کے کلام کی حیثیت سے خاص اہمیت کی حامل ہیں یہ نکتہ نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ جولائی ۱۸۸۸ء کے بعد صفیرؔ کم و بیش ہر دوسرے تیسرے شمارے میں شامل نظر آتے ہیں۔ مگر "پیام یار" کے صفحات پر ان کا آخری کلام اگست ۱۸۸۹ء میں چھپا حالانکہ وہ ۱۱ مئی ۱۸۹۰ء تک زندہ رہے۔ شاید ان کی زندگی کے آخری آٹھ مہینے ایسے سقیم گذرے کہ وہ مشقِ سخن یا کسی قسم کی ذہنی کوفت کو برداشت کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ یہ غزلیں زیادہ تر طرحی ہیں۔ اس لئے غزل کے ساتھ ساتھ میں نے مصرع طرح بھی درج کر دیا ہے۔

پیام یار جنوری ۱۸۸۸ء

طرح "ہزاروں حسرتوں کو لے کے میرا دل نکلتا ہے"

بنی ہے جان پر حسرت سے نیلی آنکھوں سے ڈھلتا ہے
دلِ زخمی سے کس کے تیر کا پیکاں نکلتا ہے

نہ تو ہی یاں تک آتا ہے نہ مجھکو واں رسائی ہے
ستم پرور نہ قسمت سے نہ تجھ سے زور چلتا ہے

الگ سوئے تھے ہم سے روٹھ کر آخر یہ کہہ اٹھے!
بغل میں سو رہو آکر ہمارا جی دہلتا ہے

تمہارے گھر میں کیا آؤں وہاں اغیار رہتے ہیں
تمنا اس کو ہوتی ہے کہ جس کا جی بہلتا ہے

شبِ وصلت کی چالوں کو نہ پوچھو گو مگو کی ہیں
کسی کا ہاتھ چلتا ہے، کسی کا پاؤں چلتا ہے

صفیرِ خستہ کو اے ناصحو! معلوم ہے سب کچھ
ٹھہر جاؤ کوئی دن میں ہمارا دل سنبھلتا ہے

پیامِ یار جولائی ۱۸۸۸ء

طرح "ہم ہیں ان کی یاد میں وہ ہیں ہماری یاد میں"

شدتِ غم سے خلل آئے نہ اُس کی یاد میں
ایک کھٹکا ہے تو بس یہ ہے مری فریاد میں

ساری دنیا کیا خدا کو بھول جاتے ہیں بشر
اے بتو! بس اک یہی لم ہے تمہاری یاد میں

لغزشِ مستانۂ ساقی نے دکھلائے مزے
ہم تو اپنا پا گئے مطلب اسی افتاد میں

غیر کا بھی دھیان آتا ہے تمہارے ساتھ ساتھ
ایک آفت اور یہ بھی ہے تمہاری یاد میں

اے صفیرؔ استاد میرے تھے سحرؔ غالبؔ، دبیرؔ
تھی الگ اک بات سب سے میرے ہر استاد میں

اس مقطع میں شیخ امان علی سحرؔ لکھنوی، مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ، دہلوی، اور مرزا دبیرؔ لکھنوی کی طرف اشارہ ہے۔ صفیرؔ تقریباً ۱۸ سال (۱۸۵۲ء) کی عمر میں لکھنؤ جا کر سحرؔ کے شاگرد ہوئے، ۱۸۵۷ء میں مرثیہ گوئی کا شوق ہوا تو مرزا دبیرؔ کی شاگردی اختیار کی اور ۱۸۶۳ء میں پہلے بذریعہ خط و کتابت غالبؔ کا تلمذ حاصل کیا۔ بعد میں مئی ۱۸۶۵ء میں خود دلی جا کر غالبؔ کی خدمت میں بہت دن حاضر رہے۔

پیامِ یار ستمبر ۱۸۸۸ء

طرح "وہ درد نہیں جس کی طبیبوں سے دوا ہو"

گر آج وفا وعدۂ فردا ہو تو کیا ہو
کچھ فرض یہی ہے کہ قیامت ہی بپا ہو

ہر آن میں تم موجدِ صد ناز و ادا ہو
حیران ہوں میں دل مرا کس کس پہ فدا ہو

احوال مرا آنکھوں سے خود دیکھ چکے ہو
للہ نہ اب تو مرے پہلو سے جدا ہو

آئینہ صفائی کے سبب ہے تنِ روشن
تم دل میں کوئی بات چھپاؤ تو مزا ہو

بلبل ترے ہمجنسوں کی ایسی نہیں آواز
صیاد نہ ٹٹی میں کہیں بول رہا ہو

رونا مجھے اس راز پہ آتا ہے کہ جس سے
کچھ کام نہ نکلا ہو، عبث فاش ہوا ہو

اے بے خودیِ لذتِ دیدار! دہائی
آنے کو پلٹ کر وہ کہیں کر نہ گیا ہو

تم صادق الاقرار ہو، تم قول کے سچے
شاید کہ ہمیں وعدہ خلافی کا مزا ہو!

ہوں کشتۂ خاموشیِ چشمانِ سخن گو
جیسے کہ اشاروں میں کوئی بول رہا ہو

درماندۂ رہ کوئی نظر آتا ہے وہ اور
ہو تیر اصیفرؔ آہ کہ نقشِ کفِ پا ہو

پیامِ یار۔ نومبر ۱۸۸۸ء

طرح "پری خانہ بنا رکھا ہے میں نے اپنے زنداں کو"

کہے جاتے ہیں، سمجھاتے ہیں کب سے تیرے درباں کو
نہ ملنے خراب ہم پھاندتے ہیں بامِ ایواں کو

یہ سیہ بختی تو دیکھو میری، ہے ہے غیر کے ڈر سے

بجھا کر لاتے ہیں تربت پہ وہ شمعِ فروزاں کو
بتنگ آتا ہے میرا چارہ گر جب دستِ وحشت سے
جنوں کہتا ہے ہنس کر اور سلواؤ گریباں کو
چھپاؤ منہ نہ برقع میں کہ عاشق ہونگے سرگرداں
ہوا کے جھونکے ڈھونڈیں گے چراغِ زیرِ داماں کو
نمودِ حشر کی خاطر ترا دامن کریں رنگیں
خدا توفیق دے اتنی کہیں خونِ شہیداں کو
یہ آنکھوں میں سماتے ہیں، یہ صحن دل میں پھرتے ہیں
مری نظروں سے دیکھے تو کوئی رفتارِ خوباں کو
پہنچتا ہوں بڑی حکمت سے پاس ان کے صفیر اب تو
نظر میں بھانپ لیتا ہوں میں پہلے سے نگہباں کو

پیامِ یار دسمبر ۱۸۸۸ء

طرح " مریضِ عشق شبِ ہجر نیم جاں ہو گا "

شبِ وصال اگر ضبط درمیاں ہوگا
تو آپ کا بھی مرے ساتھ امتحاں ہو گا
یہ منہ پھرے گا جدھر ہو گا تو بتِ رعنا
یہ سر جھکے گا جہاں تیرا آستاں ہو گا
جو سیرِ باغ کو بن ٹھن کے جائے گا یونہی
فساد بھی گل و بلبل کے درمیاں ہو گا
وفائے وعدۂ دیدار کی یہی صورت ہے
بروزِ حشر اگر ربطِ جسم و جاں ہو گا
صفیر جوڑ یہ اچھا نکالا قسمت نے
میں بے زباں جو بنوں گا وہ بے دہاں ہو گا

پیامِ یار جنوری ۱۸۸۹ء

اس شمارے میں طرح تو یہ تھی "کراہا کرتے ہیں سینہ فگار آہستہ آہستہ" مگر صفیر کی غزل "غزلیاتِ غیر طرح" کے تحت شائع ہوئی ہے۔ یہ غزل اسی طرح میں ہے جو ستمبر ۱۸۸۸ء کے شمارے کی تھی۔ صفیر نے جنوری ۱۸۸۹ء میں اس زمین میں ۹ شعر شائع کرائے مگر تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان ۹ اشعار میں ۵ شعر پہلی غزل ہی کے ہیں۔ نئے شعر صرف ۴ ہیں اور یہاں یہی ۴ شعر درج کئے جاتے ہیں۔

جب وعدہ کیا، سوچ عبث، فکر ہے بے کار
اک جلوۂ مستانہ دکھا جاؤ وفا ہو

بٹھلائے ہوئے قیس کو ہو آبلہ پائی!
آنکلے کہیں ناقۂ لیلے تو مزا ہو

بے جان جس آواز پہ تم ہو گئے اے جان!
شاید وہ کسی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہو

لکھا ہے کسے نامۂ رنگیں کہ صفیر آج
اسطرح سے گلبانگ زناں نغمہ سرا ہو

پیامِ یار فروری ۱۸۸۹ء

طرح "بتایئے تو سہی ہم میں ہے برائی کیا"

ہمارے آگے نظر غیر سے لڑائی کیا
دکھائی آپ نے دیدوں کی یہ صفائی کیا

بیانِ خلد جو کرتے ہیں جوش میں واعظ
شراب چشمۂ کوثر سے کھینچ کر آئی کیا

جو کہیے فیصلہ کر دو تو کہتے ہیں کہ یہ خوش
ہمارے آپ کے کس بات کی صفائی کیا

شبِ وصال یہ کہتا کسی کا آفت ہے
تمہارے آگے بھلا جان ہے پرائی کیا
ہمیں بہشت سے محروم کرتا ہے واعظ
سند دکھا کہ ترے ہاتھ ہے خدائی کیا
یہاں جو کچھ ہے وہ اے جان اپنے تصور میں
ترا وصال ہے کیا اور ہے جدائی کیا
صفیرؔ ہوش میں ان روزوں ہیں نظر آتے
طبیعت آپ کی قابو میں پھر اب آئی کیا

پیام یار مارچ ۱۸۸۹ء

طرح "کسی کے وصل کے امیدوار ہم بھی ہیں۔"

قتیلِ ہستیٔ ناپائدار ہم بھی ہیں
فسانۂ ستمِ روزگار ہم بھی ہیں
ہر ایک رنگ ہے موقع پر اپنے حسن نما
خزاں پکار رہی ہے بہار ہم بھی ہیں
یہ ذکر حوروں کا اس جوش سے پھر اے ناصح
کہیں گے آپ بھی پرہیزگار ہم بھی ہیں
ابھی رقیب کو تاکا ہے جس نظر سے حضور
اسی نگاہ کے امیدوار ہم بھی ہیں
ہمیں سمجھ لے وہ بس جیسا جس کا جی چاہے
عدو، عدو کے ہیں یاروں کے یار ہم بھی ہیں
ضرور کہتے یہ ہوں گے حسین خلوت میں!
عجیب شاہدِ بے اعتبار ہم بھی ہیں
یہاں بھی جاگتے کٹتی ہے وصل و ہجر کی رات
خبر ہے، زاہدِ شب زندہ دار ہم بھی ہیں
صفیرؔ جاتے نہیں واں تو بارِ عام کے وقت
کہیں گے آپ بھی امیدوار ہم بھی ہیں

پیام یار۔ اپریل ۱۸۸۹ء

طرح "زندگی رکھ چھوڑیں کس دن کے لیے"

خوش ہوں وہ مرتے ہیں ہم جن کے لیے
"زندگی رکھ چھوڑیں کس دن کے لیے"

اب جوانی آئی نچلے بیٹھیے
شوخیاں زیبا ہیں کم سن کے لیے

اے شبِ غم اس قدر ایذا نہ دے
بدلے تو نے مجھ سے کس دن کے لیے

وصل میں جب ہے تمہارا اختیار
چاہیے کیا عُذر ممکن کے لیے

جس قدر شوخی کرو زیبا ہے بس
سب معاف اے جان! اس سن کے لیے

پیر ہو کر عشقبازی کیوں صفیر
سوچیے زیبا ہے اس سن کے لیے

پیامِ یار - مئی ۱۸۸۹ء

طرح "آئے ہیں وہ تو منہ کو چھپائے مرے آگے"

کل تک بھی جو سترما کے نہ آئے مرے آگے
لو آج وہ یوں باتیں بنائے مرے آگے

اس قامتِ موزوں کا جو دیدار ہے مشکل
کمبخت قیامت ہی پھر آئے مرے آگے

وہ جام پیئے غیر کے ہاتھوں مرے ہوتے
وہ غیر کو نشہ میں اٹھائے مرے آگے

اس شوخ کا دیدار تعجب ہے تعجب!
جو شوخ تصور میں نہ آئے مرے آگے

لیلیٰ کو وہ دیوانہ کرے سامنے اپنے
مجنوں کو وہ ہشیار بنائے مرے آگے

دھڑکا مجھے محفل میں صفیر اور نہیں ہے
دشمن نہ کہیں آگ لگائے مرے آگے

پیامِ یار - اگست ۱۸۸۹ء

طرح "خدا جانے کس کی نظر کھا گئی"

تصور میں کس کے یہ نیند آگئی
پرستان کا خواب دکھلا گئی

گئے ہم گیا وقت، موقع گیا
نہ دل سے تمہاری تمنا گئی

حسینوں کو الفت میں تھا اور کیا
طبیعت کو کچھ روزوں بہلا گئی

شب وصل خود بوسہ لے کر انھیں
یہ شوخی تو دیکھو حیا آگئی

اگر کام مجھ سے نہیں ہے تمہیں!
زباں پہ شکایت بھی کیوں آگئی

نہ پوچھو کہ پیری میں کیا کیا گیا
ہر اک بات کی بس تمنا گئی

یہاں اپنا وعدہ برابر ہوا
وہ آتے رہے اور موت آگئی

کہاں آنا جانا اب ان کا صفیرؔ　　جو آئی کبھی ان کی یاد آگئی!

عبدالمالک آروی نے لکھا ہے کہ "اگر صفیرؔ، غالبؔ جیسے شفیق استاد سے اصلاح لیتے رہتے تو یقیناً آج بہار کے سب سے بڑے شاعر ہوتے۔ لکھنؤ کی شاعری نے ان کے اندر پریشان نظری اور ادبی گمرہی پیدا کر دی"۔ صفیرؔ نے غالبؔ سے پانچ چھ سال استفادہ کیا مگر وہ غیر معمولی قدرتِ شعر گوئی کے باوصف شمہ بھر غالبؔ کا رنگ نہ اپنا سکے۔ اوپر دیا ہوا ان کا آخری عمر کا کلام شاہد ہے کہ ان کا معیار شاعری طوائف کی چھیڑ چھاڑ سے اوپر نہ اٹھ سکا۔ کلام میں گہرائی ایسی چیز کا دور دور تک پتہ نہیں۔

(۴۹)

اُردوئے معلیٰ - اکمل المطابع دہلی ۱۸۶۹ء

غالب منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔ (۲۷ نومبر ۱۸۵۸ء) :

(ص ۹۲) " لالہ گنگا پرشاد شاد تخلص اپنے کو تمہارا شاگرد بتاتے ہیں مگر ریختہ کہتے ہیں کئی دن ہوئے کہ یہاں آئے اور بالمکند بے صبر کی غزلیں اصلاح کو لائے وہ دیکھ کر ان کے حوالے کردیں ....."

تاحال گنگا پرشاد شاد، شاگرد تفتہ کا کوئی حال معلوم نہیں ہوا، البتہ آثار الشعرائے ہنود (ص ۷۵) میں "شاد تخلص سکندرہ آباد کے برہمنوں سے کوئی حضرت تھے" لکھا ہوا ملا۔ مگر نام اور تفتہ کی شاگردی کا ذکر نہیں۔ یوں بھی یہاں برہمن لکھا ہے اور غالب اسے لالہ کہتے ہیں جس سے شاد کا غیر برہمن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ایک شعر بھی درج ہے ؎

اس رنگ چمپئی کا پڑا جس زمیں پہ عکس

چمپا کے پھول اُگتے ہیں واں سے بہار میں

اس لئے خیال ہوتا ہے کہ یہ لالہ گنگا پرشاد شاد تو نہ ہوں گے البتہ خمخانۂ جاوید جلد چہارم ص ۳۵۵ پر ایک لالہ گنگا پرشاد کا ذکر ہے جو ہیں تو اسی عہد کے مگر خود کو علی الاعلان حاتم علی مہر کا شاگرد بتاتے ہیں۔ ترجمہ یہ ہے۔

"شاد گنگا پرشاد صاحب کایستھ ساکن آگرہ شاگرد مرزا حاتم علی مہر اکبر آبادی۔ ۱۲۸۰ھ میں ۳۳ سال کی عمر تھی اور عدالت ہائی کورٹ میں وکیل تھے۔ طبیعت نہایت رسا اور شوخ تھی۔"

منونۂ کلام کے طور پہ چار شعر دیے ہیں۔ صرف مقطع دیا جاتا ہے جس سے مہر کی شاگردی ظاہر ہے ؎

تلمذ مہر سے ہے، شاد! کیونکر ہوں نہ خوش طالع

یقیں ہے طبع روشن اپنی جلوہ طور کا ٹھہرے

ماسٹر شنکر دیال عاشق اکبر آبادی شاگرد غالب کی بہن انھیں گنگا پرشاد شاد سے منسوب تھیں۔

(ص ۶۷) خط بنام تفتہ ۔ ۳ جنوری ۱۸۵۹ء) " لکھنے کے قابل بات پھر بھول گیا۔ کل میر کرامت علی صفا تخلص کہ میں نے آگے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا، ناگاہ، مجھ سے آکر ملے اور تمہارا حال پوچھتے رہے میں نے کہہ دیا کہ بخیر و عافیت سکندر آباد میں ہیں جب میں نے ان سے کہا کہ کیا وہ تمہارے آشنا ہیں۔ انھوں نے کہا صاحب وہ میرے بزرگ اور استاد

ہیں میں ان کا شاگرد ہوں۔ کس مدرسے کے علاقے میں نوکر ہیں۔ لسبیل
ڈاک آئے تھے اور آج لسبیل ڈاک انبالہ کو گئے، انبالہ ان کا وطن ہے
اور نوکر بھی اسی ضلع میں ہیں۔"

میر کرامت علی صفا کے بارے میں غالب کی دی ہوئی اطلاع سے زیادہ تا حال معلوم نہیں ہو سکا۔ مگر اردوئے معلّٰی حصہ دوم مطبع مجتبائی ۱۸۹۹ء ص ۸۹ پر غالب کا ایک خط بنام مولوی کرامت علی شائع ہوا ہے، جس میں غالب لکھتے ہیں "فقیر اسد اللہ جناب مخدومی مولوی کرامت علی صاحب کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ آپ کی تحریر کے دیکھنے سے یاد آیا کہ آپ میرے ہاں آئے ہیں۔ اور میں نے آپ کی ملاقات سے حظ اٹھایا ہے ...." جناب مرتضیٰ حسین فاضل کا گمان ہے کہ یہ خط ۱۸۶۰ء کے بعد کا ہے۔ اور غلام رسول مہر مرحوم کہتے ہیں کہ یہ کرامت علی انبالے میں ملازم تھے کیا یہ کرامت علی، میر کرامت علی صفا انبالوی ہی تو نہیں؟

(۵۰)

اردوئے معلّٰی۔ اکمل المطابع دہلی۔ ۱۸۸۹ء۔ ص ۹۳

غالب منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"پنڈت بدری ناتھ یا بدری داس، ڈاک منشی کرنال آبخہ مجھ سے اس
سے ملاقات ظاہری نہیں ہے مگر میں جب جیتا تھا تو وہ کلام میرے پاس
اصلاح کے واسطے بھیجتا تھا، بعد اپنے مرنے کے (یعنی ترکِ اصلاح شعر کرنے) کے
میں نے اسکو لکھ بھیجا کہ اب تم اپنا کلام منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس بھیج دیا
کرو۔ اب تم کو بھی لکھتا ہوں کہ تم میرے اس لکھنے کی انکو اطلاع لکھو...."

غالب نے گنگا پرشاد شاد کے سلسلے میں بطورِ خاص لکھا ہے کہ "ریختہ کہتے ہیں"۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ پنڈت بدری ناتھ (یا بدری داس) فارسی لکھتے ہونگے اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ بدری ناتھ غالب سے باقاعدہ اصلاح لیتے تھے۔ تذکروں میں غالب کے عہد میں اور اس کے بعد بدری ناتھ نام تو آتا ہے مگر وہ غالب یا تفتہ کے شاگرد نہ تھے۔ اگر غالب نام کے ساتھ تخلص کا ذکر بھی کر دیتے تو غالب کے شاگردوں میں ایک اور باقاعدہ شاگرد کا اضافہ ہو سکتا تھا۔

اشاریہ

۱۔ کسی ہندسے کے نیچے لکیر سے یہ مراد ہے کہ اس صفحے پر یہ نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔

۲۔ ترتیب بلحاظِ حروفِ تہجی صرف پہلے ہی حرف تک ہے۔

۳۔ اشاریہ صرف ضروری نشاندہی تک محدود ہے۔

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

(۱) افراد وغیرہ

الف

ب

پ

ت

(۲) مقامات وغیرہ

(۳) کتب و رسائل وغیرہ

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date